غالب
بہادر شاہ ظفر
اور
1857

شمیم طارق

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

غالب، بہادر شاہ ظفر اور 1857

شمیم طارق

ناشر

غالب اکیڈمی، نئی دہلی

پیش لفظ

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کا آغاز 1875 میں ہوا تھا۔ 2007 پہلی جنگ آزادی کا 150واں سال ہے۔ اس مناسبت سے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر غالب اکیڈمی نے خواجہ حسن نظامی دہلوی کا تالیف کردہ مرزا غالب کا روزنامچہ شائع کیا۔ مرزا غالب کے 210ویں یوم ولادت کے موقع پر 27/دسمبر 2007 کو ایک مخصوص تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس تقریب میں جناب شمیم طارق نے غالب، بہادر شاہ ظفر اور 1857 کے عنوان سے خطبہ دیا۔

غالب ایسے شاعر ہیں جنھوں نے 1857 سے پہلے کی دہلی دیکھی اور 1857 کے بعد کی بھی۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے بھی وابستہ رہے۔ اس لیے غالب اکیڈمی کے اراکین نے غالب کے یوم ولادت کے موقع پر خطبہ کا موضوع غالب، بہادر شاہ ظفر اور 1857 منتخب کیا۔ غالب اور 1857 کے تعلق سے خواجہ صاحب کے تالیف کردہ روزنامچہ کے علاوہ کوئی اور تصنیف نہیں ملتی۔ جناب شمیم طارق نے اس موضوع پر باقاعدہ کتاب 'غالب اور ہماری تحریک آزادی' کے عنوان سے تصنیف کی جس کا پہلا ایڈیشن 2002 اور دوسرا ایڈیشن 2007 میں شائع ہوا ہے۔ ان کے اس کام کو دیکھتے ہوئے انھیں 27/دسمبر 2007 کو غالب، بہادر شاہ ظفر اور 1857 کے موضوع پر خطبہ دینے کی دعوت دی جسے انھوں نے منظور کیا اور اس یقین دہانی کے ساتھ خطبہ دیا کہ وہ اپنے خطبہ کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے لیے جلد بھیج دیں گے۔ حسب وعدہ انھوں نے اپنے خطبہ کو تحریری شکل میں کمپوزنگ کراکے برائے اشاعت عنایت کیا۔

جناب شمیم طارق نے اپنے خطبہ میں خاص طور سے موضوع سے متعلق ماخذ پر گفتگو کی تھی۔ خطبہ چونکہ تحریری شکل میں موجود نہیں تھا اس لیے صرف ماخذ کی طرف اشارے کیے

گئے تھے لیکن اس کتاب میں ان ماخذ کا باقاعدہ حوالہ موجود ہے۔ ان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی شکل ان تاریخوں، تذکروں اور داستانوں کی ہے جو انگریز دوستوں نے بیان کیے ہیں۔ دوسری شکل کارل مارکس کی کتاب The Indian War of Independence 1857-1859 ہے۔ تیسری شکل 1857 تک جاری رہنے والے اخبارات کی ہے۔ چوتھی شکل ملفوظاتی ادب کی ہے ۔ پانچویں شکل انگریزوں کی رپورٹوں، ڈائریوں، یادداشتوں، ٹریونل کے فیصلوں اور انتظامی امور کے متعلق جاری کیے گئے حکم ناموں کی ہے۔ان پانچوں شکلوں پر مصنف نے نہ صرف بھرپور گفتگو کی ہے بلکہ ان کے حوالے سے تینوں عنوانات غالب، بہادر شاہ ظفر اور 1857 پر روشنی ڈالی ہے اور اس حقیقت کو ظاہر کیا ہے کہ 1860 سے ایسی کتابیں شائع ہونا شروع ہوگئیں تھیں جس میں انگریزوں نے اپنی زیادتیوں کے اعتراف کے ساتھ اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ان کی حکومت ریت کے جزیرہ پر تعمیر ہونے والے محل جیسی ہے جو کسی وقت بھی زمیں بوس ہوسکتی ہے۔ غالب کے حوالے سے جناب شمیم طارق نے لکھا ہے کہ غالب نے ایک نوشعری قطعہ اور ایک شعر کے علاوہ اپنے مشاہدات کو پیش نہیں کیا۔خطوط، دوسری نثری تحریروں اور دستنبو میں جو اشارے ملتے ہیں اس سے بھی 1857 کی پوری تصویر سامنے نہیں آتی۔ یہ غالب کی مجبوری تھی۔کتاب میں غالب کی مجبوریوں کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر پر انگریزوں سے زیادہ ظلم ان کے عزیزوں نے ڈھائے جو انگریزوں کے مخبر تھے۔ اس کتاب میں ان باتوں پر سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے۔شمیم طارق صاحب کی باتوں س سے اختلاف کی بہت گنجائش ہے لیکن انھوں نے جو ماخذ پیش کئے ہیں ان سے غالب ،بہادرشاہ ظفراور 1857 پر مزید تحقیق کے باب کھلتے ہیں اسی مقصد سے ان کے خطبے کو کتابی صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔ کتاب مختصر مگر جامع اور معلوماتی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب غالب، بہادر شاہ ظفر اور 1857 پر کام کرنے والوں کے لیے کارآمد ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر عقیل احمد
سکریٹری
غالب اکیڈمی

غالب، بہادر شاہ ظفر اور ۱۸۵۷ء

۱۸۵۷ء کے ۱۵۰ ویں سال میں غالب کے
۲۱۰ ویں یومِ ولادت کے موقع پر غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں
جناب شمیم طارق کا خطبہ

میں انتہائی شکر گزار ہوں ملک کے نہایت باوقار علمی ادبی ادارے غالب اکیڈمی کے ذمہ داروں اور عہدیداروں کا جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے ۱۵۰ ویں سال میں غالب کے ۲۱۰ ویں یوم ولادت کے موقع پر ایک ایسے موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی ہے جس پر بارہا گفتگو ہو چکی ہے، نئے نئے مباحث سامنے آتے رہے ہیں، کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں اس کے باوجود محسوس ہوتا ہے کہ اس موضوع پر بہت کچھ کہنے سننے کی گنجائش اب بھی موجود ہے۔ موضوع ہے :

غالب، بہادر شاہ ظفر اور ۱۸۵۷ء

تین اجزا کا مرکب ہے یہ موضوع۔ اور ان تین اجزا میں سے جن کا مرکب ہے یہ موضوع، ہر جزو اپنے آپ میں مکمل ہے اور عنوان بن سکتا ہے کسی تقریر، تحریر یا مکالمے کا۔

غالب نام ہے ایک اعلیٰ دماغ شخص اور جامع صفات شخصیت کا۔ ایک ایسی جامع صفات شخصیت کا جو بشری کمزوریوں اور تقاضوں سے خالی نہیں ہے۔ نہ ہی اس نے اپنی بشری کمزوریوں کی پردہ پوشی کی کوشش کی ہے۔ اس پر جب بشری تقاضے غالب ہوئے ہیں تو اس نے محرومیِ قسمت کی شکایت کرنے میں کوئی جھجھک محسوس کی ہے نہ ہی مرجانے کی تمنا کا اظہار کرنے میں کوئی قباحت

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

لیکن جب اس کی طبیعت کی جولانیوں نے اس کو مطلعِ فکر و احساس کی سربلندیوں سے ہمکنار کیا ہے تو اس نے حیات و کائنات ہی نہیں بندگی کی حدود کو پامال کر کے آگے بڑھ جانے کی کوشش میں آواز دی ہے کہ

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

غالب نام ہے ایک خلاق ذہن کا جس نے اپنی تخلیقی قوتوں سے روزمرہ کے سیدھے سادے اور عام فہم لفظوں کو بھی گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دیا۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

غالب نام ہے ایک ایسے نابغۂ روزگار شاعر کا جس نے یہی نہیں کہ قضاء و قدر کے مسئلوں کو بھی ظرافت و مزاح کا پیکر عطا کیا بلکہ ایک خاص کیفیت میں صاحبانِ القاء و الہام کی

ہم سری کے دعوے سے بھی گریز نہیں کیا :

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غالب نام ہے ایک ایسے بانکے سجیلے غزل گو کا جس کی غزل کے آئینے میں ہر عہد اپنا چہرہ دیکھتا ہے مگر وہ آئینہ میلا نہیں ہوتا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک کے عہد کا مکمل چہرہ اگر اس میں نہیں ہے اور اس دوران غالب نے ایک نو شعری قطعہ اور ایک شعر کے سوا کچھ نہیں کہا یا ۱۸۵۷ء کے واقعات ان کا شعری تجربہ نہیں بن سکے تو اس کی کئی وجوہ میں ایک وجہ یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں ان کی شعر گوئی کی اس بے پناہ قوت پر زوال آگیا تھا جس کو عطا کرنے میں مبداء فیض نے بڑی فیاضی کا مظاہرہ کیا تھا۔ غالب نے اس کا استعمال عیش و عشرت کے حصول اور زیادہ سے زیادہ آسائشیں حاصل کرنے کے علاوہ کسی اعلیٰ مقصد کے لیے نہیں کیا تو اس سے محروم کردیے گئے ۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد ایک دو نہیں کئی بار اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ ان کا ذوق شعر باطل ہوگیا ہے یا وہ پہلے کی طرح شعر کہنے پر قادر نہیں رہ گئے ہیں۔ ثبوت میں ایک دو نہیں، کئی خطوط پیش کیے جاسکتے ہیں مثلاً مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام جون یا جولائی ۱۸۵۸ء، ۱۸۶۱ اور ۱۸۶۳ یا ۱۸۶۷ء کے خطوط،

نواب علاء الدین احمد خاں علائی کے نام ۲ جولائی ۱۸۶۰ء کا خط، چودھری عبدالغفور سرور کے نام ستمبر ۱۸۵۹ء کا خط یا کلب علی خان کے نام ۱۰ ستمبر ۱۸۶۶ء کا خط۔ یہاں صرف چودھری عبدالغفور سرور کے نام اکتوبر/ نومبر ۱۸۵۹ء کا ان کا ایک خط پیش ہے :

'میں اموات میں ہوں۔ مردہ شعر کیا کہے گا۔ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں۔ جو غزل کی روشن ضمیر میں آوے؟ ......ضاعت شعر، اعضاء و جوارح کا کام نہیں، دل چاہیے دماغ چاہیے ذوق چاہیے امنگ چاہیے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں؟ چونسٹھ برس کی عمر میں ولولۂ شباب کہاں؟ رعایت فن، اس کے اسباب کہاں؟ اناللہ و انا الیہ راجعون۔''

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی زیادہ توجہ نثر پر رہی۔ اس دوران انھوں نے ''دستنبوٗ کے علاوہ انگریزوں کی مدح میں کئی مضامین بھی لکھے۔ مثال کے طور پر ۲۳/ اپریل ۱۸۶۲ء کو لکھنؤ کے'' اودھ اخبار'' میں ان کی ایک تحریر شائع ہوئی جو

انگریزوں کی سراسر تعریف و تحسین میں تھی۔ خطوط لکھنے کے وہ پہلے سے عادی تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں انھوں نے بہت سے حوالے حذف کردیے یا مخاطب کو خط ضائع کردینے کی تاکید کی۔

ان خطوط کے غالب اپنے آدمی ہونے پر شرمندہ نہیں بلکہ اتنے بے باک ہیں کہ چند اہم واقعات کے علاوہ روز مرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور زندگی کی ادنیٰ ترین حقیقتوں کو بھی تسلیم کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ ان کے خطوط میں عہد اور معاشرہ کی تصویروں کے ساتھ بہرحال جیتے رہنے کی ان کی شدید خواہش، آرزو اور شکست آرزو کے ناتمام سلسلے اور کسی سے کسی طرح کچھ بھی پالینے کی تمنا بہت شدید ہے۔ زندگی کی ہماہمی کے ساتھ مرگ آسا سنائے ہیں مرنے کے اندیشے اور جینے کے حوصلے ہیں، کبھی لڑتے جھگڑتے، گالم گلوج کرتے اور کبھی ہنستے بولتے، خبر گیری کرتے گوشت پوست کے انسان ہیں۔ ان میں پابند و آزاد آدمیوں کی مختلف کیفیتوں اور حالتوں کی پردہ داری اور تصویر کشی بھی ہے یعنی ان خطوط میں غالب کی زندگی، انسانی زندگی کی جملہ کثافتوں اور لطافتوں کا مجموعہ بن کر سامنے آئی ہے۔ ان کے خطوط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ احساس جتنا زیادہ ہو، احساس نارسائی کا زخم اتنا ہی گہرا ہوتا ہے، اس لیے حواس کی بیداری اور لہو کی گردش سے آواز وحرف کو نئے جہان معنی سے آشنا کرنے، دشت امکاں کو ایک نقش پا سے زیادہ نہ سمجھنے اور تمنا کے دوسرے قدم کے لیے جہان تازہ کی ضرورت کا احساس دلانے والے غالب، احساس نارسائی کے دیے ہوئے زخموں سے کچھ زیادہ ہی پریشان رہے ہیں۔ انھیں کبھی بچوں کے نہ جینے، ذوق کے ان سے رتبہ میں بڑھ جانے اور خاطر خواہ شہرت و منصب نہ ملنے کا غم ستاتا رہا ہے اور کبھی دلّی کے اُجڑنے، احباب کے بچھڑنے اور خلعت و پنشن سے محروم ہوجانے یا خلعت و پنشن میں اضافہ نہ ہونے کا رنج۔ شوخی و افسردگی دونوں کا کرشماتی نمونہ ہیں غالب کے خطوط۔

بہادر شاہ ظفر نام ہے ہندوستان کی تاریخ کے ایک مظلوم شخص کا۔ ایک ایسے مظلوم شخص کا جس کی زندگی اور زندگی کے حالات و واقعات کا مطالعہ مشیت الٰہی کے عقیدے اور اس کے فلسفے کی روشنی میں کریں تو بھی درست، اگر تاریخ کے جبر کے حوالے سے کریں تو بھی درست اور اگر ان سازشوں کے پس منظر میں کریں جو نئے حکمرانوں کے حلقوں، لال قلعہ میں رہنے والوں اور خود خاندان تیموریہ سے تعلق رکھنے والوں کے بیچ رچی جارہی تھیں تو بھی درست۔ لیکن اسی کے ساتھ بہادر شاہ ظفر ایک علامت بھی تھے بے بسی و کسمپرسی کی۔ وہ انگریزوں کے پنشن خوار تھے مگر بادشاہ اس لیے کہے جاتے تھے کہ خاندان تیموریہ کے

بادشاہوں کا خون گردش کررہا تھا ان کی رگوں میں۔ بہادر شاہ ظفر کے تمام اختیارات سلب کیے جاچکے تھے۔ اقتدار تو ان کے دادا کے زمانے سے ہی ختم ہوچکا تھا۔ پنشن اور مراعات میں مسلسل کمی ہوتی جارہی تھی۔ انگریزوں کا رویہ بھی تضحیک آمیز ہوتا جارہا تھا اس کے باوجود وہ بادشاہ اس لیے کہے جاتے تھے کہ وہ لال قلعہ کے والی اور وارث تھے۔ بہادر شاہ ظفر کو وہ شاہانہ وقار ایک پل کے لیے بھی نصیب نہیں ہوا جو بابر سے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر تک ہر مغل بادشاہ کو حاصل تھا مگر وہ بادشاہ اس لیے کہے جاتے تھے کہ داد و دہش، اہل علم اور اہل ہنر کی قدر دانی اور رعایہ پروری جیسے شاہانہ اوصاف ان کے مزاج و کردار کا حصہ تھے اور ایسے دور میں بھی جب وہ پنشن پر گزارہ کررہے تھے، اہل علم و ہنر اور اہل دین و دانش کی مالی اعانت میں کمی نہیں کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسی خونیں لکیر کا نام ہے جو وقت کے ساتھ مدھم ہونے کے بجائے نمایاں ہوتی جارہی ہے۔ اس کو ہندوستان کے سادہ لوح عوام کا قتل عام کہیں تو درست، ہندوستان کے سابق حکمرانوں کے ہم مذہبوں کا قتل عام کہیں تو درست، قیامت صغرائی کہیں تو درست، ایک عہد کا خاتمہ کہیں تو درست اور ایک عہد کا آغاز کہیں تو درست۔ ایک عہد کا آغاز اس لیے کہ اس کے صرف ۹۰ سال بعد انگریز آزادی کی متعین تاریخ سے پہلے ہی ملک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگئے اور ہم ہندوستانیوں کو آزادی وطن کی وہ نعمت بے بہا نصیب ہوئی جو ہر شخص کی فطرت کی طلب ہے۔ ۱۸۵۷ء کا ذکر آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ ملک کی آزادی کے لیے قربان ہونے والے ہر جانثار اور سورما کی روح ہمارے حافظے اور سماعت پر دستک دیتے ہوئے یاد دلارہی ہے کہ:

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض چکائے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

موضوع بہت وسیع ہے اور اس موضوع کا حق تبھی ادا ہوسکتا ہے جب موضوع کے تمام اجزا کا احاطہ کیا جائے اور وہ بھی مختلف زاویوں سے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ گفتگو ہو کن بنیادوں پر؟ غالب اور بہادر شاہ ظفر تاریخی شخصیتیں ہیں، ۱۸۵۷ء تاریخ کا ایک ورق نہیں، مکمل تاریخ ہے اور تاریخ حکایات وقصص کا نام نہیں ہے۔ تاریخ خود ساختہ عقیدتوں یا کسی ہنگامی اور جذباتی وجہ سے پیدا ہوجانے والی نفرتوں کے اظہار کا نام بھی نہیں ہے۔ تاریخ قابل قبول شہادتوں اور قابل اعتبار ماخذوں کی بنیاد پر یہ دیکھنے کا نام ہے کہ کسی واقعے کے ظہور پذیر ہونے میں کون سے عوامل کارفرما تھے اور ان کے کیا

اثرات مرتب ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں جو شہادتیں اور ماخذ ہمارے سامنے ہیں ان کی پانچ شکلیں ہیں۔

(۱) پہلی شکل تو ان تاریخوں، تذکروں اور داستانوں کی ہے جو انگریز دوستوں نے بیان کی ہیں۔ مولانا ذکاء اللہ دہلوی کی کم سے کم تین کتابیں، ظہیر دہلوی کی ''داستانِ غدر'' مرزا حیرت دہلوی کی ''چراغِ دہلی''، معین الدین حسن خاں کی ''خدنگ غدر''، عبداللطیف کا روزنامچہ، مولوی رجب علی کی ''تحقیقات چشتیہ'' اور اس قسم کی دوسری کئی کتابیں اسی شکل کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان میں جو کچھ ہے سب قابل اعتبار نہیں ہے لیکن ۱۸۵۷ء میں دہلی میں کیا ہوا؟ اس کی تفصیل انہیں کتابوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے اگر ان کتابوں کو پوری طرح قبول نہیں کیا جاسکتا تو پوری طرح مسترد بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انھیں چھاننے، پھٹکنے اور دوسرے ماخذوں سے ان کا موازنہ کرنے کی ضرورت ہے۔

غالب کے خطوط، ''دستنبو'' اور کچھ دوسری تحریریں یا سرسیّد احمد خاں کی ''لائل محمڈنس آف انڈیا''، ''تاریخ سرکشی بجنور'' اور ''اسباب بغاوتِ ہند'' اگرچہ مختلف انداز کی کتابیں ہیں مگر وسیع تر پس منظر میں ۱۸۵۷ء کے ماخذ کی اسی پہلی شکل سے تعلق رکھتی ہیں۔ منشی ذکاء اللہ، مرزا حیرت اور غالب و سرسیّد کی فکر میں بہت فرق ہے۔ حالات کو پیش کرنے کا ان کا انداز اور مقصد بھی جداگانہ ہے۔ انگریزوں سے ان کے رشتے کی نوعیت بھی الگ الگ تھی لیکن چونکہ انگریزوں سے تعلق ان سب کا مشترکہ خاصہ تھا اس لیے ان سب کی تحریروں کو ایک ہی خانے میں رکھے جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔

(۲) ۱۸۵۷ء کے تاریخی ماخذ کی دوسری شکل کارل مارکس کی کتاب The Indian War of Independence 1857 - 1859 ہے۔ غضب کا سائنسی اور تجزیاتی ذہن پایا تھا اس کتاب کے مصنف نے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ اور ہندوستانیوں کی نفسیات سے ہی نہیں ہندوستان کے جغرافیہ سے بھی واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں کے مجاہدین آزادی کو ایک شہر سے دوسرے شہر پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟ ۲۵ برس پہلے جب میں اس کتاب کا پہلی مرتبہ مطالعہ کررہا تھا اس وقت ریل کے سفر میں تھا۔ الہ آباد سے پہلے مانک پور کے پاس ریل ایک حادثے کا شکار ہوگئی اور پھر جو سفر ڈیڑھ یا دو گھنٹے میں طے ہونے والا تھا ۲۰ - ۲۲ گھنٹے میں طے ہوا کیونکہ ریل کو واپس لاکر ایک دوسرے راستے سے الہ آباد لے جانا پڑا۔ دوسرے راستے پر ان مقامات کو دیکھنے کا اتفاق ہوا جہاں جنگ آزادی بڑی شدت سے لڑی گئی تھی مثلاً جھانسی، چترکوٹ، کانپور۔ حیرت ہوئی تھی کہ مارکس کو یہاں کے حالات کس

طرح معلوم ہوئے ہوں گے۔
۲ر نومبر ۲۰۰۷ء کو میں پونے میں تھا۔ وہاں ٹائمز آف انڈیا میں (اڈیشن یاد نہیں ہے) ایک صاحب کا خط پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے کارل مارکس کے مضامین پر مشتمل کتاب کو مارکس کی تصنیف تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ بعد کے لوگوں نے یہ مضامین مارکس سے منسوب کردیئے۔ ۲۸ر دسمبر ۲۰۰۷ء کی ایک خبر (ایشین ایج، ممبئی) کے مطابق نئی دہلی میں منعقدہ ''انڈین ہسٹری کانگریس'' کے سہ روزہ اجلاس میں (جس میں تقریباً ایک ہزار تاریخ داں حضرات نے شرکت کی اور تاریخ و آثارِ قدیمہ سے تعلق رکھنے والے موضوعات کے مختلف پہلوؤں پر مختلف زاویوں سے گفتگو کی) ایک کتابچہ تقسیم کیا گیا۔ اس کا عنوان تھا:

Did Moscow Play Fraud on Marx?

The Mystery of Marx-Engel's Articles on 1857

کتابچے میں ۲۸ مضامین ہیں جن میں دیویندر سروپ نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی سے متعلق تاریخی واقعات و حقائق کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ مضامین آر ایس ایس کے ترجمان ''آرگنائزر'' میں پہلے ہی شائع ہوچکے تھے۔ اس میں مارکس کے مضامین میں ظاہر کیے گئے خیالات و بیانات پر مبنی مارکسی تاریخ دانوں کے نظریات کو چیلنج کیا گیا ہے۔ اس کتابچے میں ظاہر کیے گئے خیالات و نظریات کی تائید میں تاریخ دانوں کا ایک گروہ سرگرم ہے اور اس گروہ نے Historian's Forum کے نام سے ایک محاذ بھی تشکیل دے دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مارکسی نظریات کے حامل تاریخ داں حضرات یا تاریخ پڑھانے والے اساتذہ اپنے نظریات یا ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے متعلق اپنے نقطہ ہائے نظر کو واضح کریں۔ کتابچہ میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ مارکسوادی مورخین اس بات کو شہرت دیتے رہے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران کارل مارکس لندن سے مختلف اخبارات میں رپورٹنگ کررہے تھے اور ان کی کتاب

The First Indian War of Independence 1857 - 1859

انھیں مضامین کا مجموعہ ہے لیکن آرکائیوز میں موجود نوادر سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ مارکس نے ۱۸۵۷ء سے متعلق زیادہ سے زیادہ دو مضامین لکھے تھے۔

''ٹائمز آف انڈیا'' میں شائع ہونے والے مراسلے اور ایشین ایج کی خبر کی بنیاد پر مارکس کے مضامین کو جعلی ثابت کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ خود معترض نے تسلیم کیا ہے کہ ان

میں سے دو مضامین کے مارکس کے لکھے ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ مارکس کے جو مضامین کتاب میں شامل کیے گئے ہیں ان کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ کس تاریخ کو کس اخبار میں شائع ہوئے تھے۔ مثلاً کتاب میں شامل ایک مضمون کا عنوان ہے The Revolt In India اور مضمون کے آخر میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ یہ مضمون Daily Tribune, New York میں ۲۳/ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو خاص مضمون کی حیثیت سے شائع ہوا تھا۔ ڈیلی ٹریبون، نیویارک ۱۸۴۱ء سے ۱۹۲۴ء تک جاری تھا اس لیے جب تک یہ نہ ثابت کیا جائے کہ جس شمارے کا حوالہ دیا گیا ہے وہ مضمون اس شمارے میں شامل نہیں تھا تب تک مارکس کے مضامین کے جعلی ہونے کی بات نہیں تسلیم کی جاسکتی۔ مضمون کے آخر میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ اخبار نے مارکس کے مضمون کو ایڈٹ کر کے شائع کیا تھا۔

برلن کے ''انسٹی ٹیوٹ آف مارکسزم لینن ازم'' میں ۱۴/ اگست ۱۸۵۷ء کے ایک عکسی نسخے کے موجود ہونے کی روایت بھی مختلف کتابوں میں نقل ہوتی رہی ہے۔ لہٰذا قارئین کے سامنے صرف ایک سوال ہے کہ مارکس کے مضامین ان اخبارات میں شائع ہوئے یا نہیں جہاں ان کے شائع ہونے کا ذکر کیا جاتا رہا ہے؟ مارکس کے مضامین کو جعلی ثابت کرنے اور کمیونسٹوں کے سابق مرکز ماسکو کے اس مسئلے میں جعل سازی کرنے کے بارے میں جو بھی خبریں شائع ہوئی ہیں یا باتیں کہی جارہی ہیں وہ ابھی قابل قبول نہیں ہیں۔ ایک مسئلہ زیر بحث آیا ہے اس کے مختلف پہلوؤں کو سامنے آنا ضروری ہے مگر اس سلسلے میں اب تک جو کہا سنا گیا ہے اس سے مارکس کے مضامین کے جعلی ہونے کی بات قابل قبول نہیں ہے۔

انگریزوں نے بھی ایسی بہت سی کتابیں لکھی ہیں جو لندن سے شائع ہوئی ہیں اور جن میں واضح لفظوں میں اعتراف کیا گیا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانیوں سے ان کی جائز حکومت چھین کر ان کو انسانیت سوز مظالم کا شکار بنایا تھا Edward Thompson کی تصنیف

The Other Side of The Medal

تو ۱۸۶۰ء میں ہی منظر عام پر آگئی تھی جن دوسروں کتابوں کا خصوصیت سے ذکر کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہیں:

Twelve Years of Soldier's Life in India. Hodson W. S. R. (1859)

My Diary In India In the Year 1858-59. Sir W. H. Russel (1860)

The Political Theory of Indian Mutiny. F. W. Russel (1871)
History of The Sepoy War in India. Kay J. W. (1876)
Memoires of Gen. Briggs (1885)
The Indian Mutiny of 1857.. Lalleson, G. B. London 1891
The Sepy Revolt Innes, McLeod, London 1897
The Rise and Expansion of British Domination in India.
Lyall, A. London 1905
Cheifs and Families of Note in the Punjab. Griffin, L. P.
London 1911

انگریزوں کی ہی لکھی ہوئی یہ کتابیں وہ ماخذ ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ملک گیر حیثیت کی حامل ہونے کا اندازہ سب سے پہلے انگریزوں نے ہی کیا تھا۔

(۳) تیسری شکل ان اخبارات کی شکل میں ہے جو ۱۸۵۷ء تک جاری تھے یا اس کے بعد کچھ دنوں جاری رہے۔ مثلاً دلی اردو اخبار، احسن الاخبار، سراج الاخبار، کریم الاخبار، دھلی گزٹ..... وغیرہ۔ مولانا امداد صابری کی کتابیں اور عتیق صدیقی کی کتاب ''۱۸۵۷ء : اخبار اور دستاویزیں'' اس سلسلے میں بہت اہم معلومات فراہم کرتی ہیں۔ ہندوستانی آرکائیوز میں اب بھی ایسے بہت سے شمارے موجودہ ہیں جن کی روشنی میں ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۷ء کے اہم کرداروں کو نئے انداز میں سمجھا اور پیش کیا جاسکتا ہے۔ منشی تفضل حسین خاں کی ''فغان دہلی'' بھی اسی شکل سے تعلق رکھتی ہے اس میں ان منظومات کو جمع کردیا گیا ہے جن میں دلّی کی تباہی کا ماتم کیا گیا ہے۔ ان منظومات سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے دوران اور بعد کے برسوں میں اہل وطن خاص طور سے اہل دہلی پر کیا کیا قیامت ڈھائی گئی ہوگی۔

''فغان دہلی'' جیسے شعری گلدستوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی شعری روایت جو ۱۸۵۷ء کے بہت پہلے سے جابر و ظالم حکمرانوں اور بدیسی حملہ آوروں کی مذمت کرنے میں اپنی ایک خاص شان اور شناخت پیدا کرچکی تھی، ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے برسوں میں بھی قائم رہی۔ خان آرزو فرخ سیر کے ملازم تھے۔ ان کا انتقال ۱۷۵۷ء میں یعنی ۱۸۵۷ء سے سو سال پہلے ہوچکا تھا۔ ان کے ایک شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری جفائے محبوب کی مذمت کی شکل میں حکمرانوں اور حملہ آوروں کی

مذمت کے حوصلے اور سلیقے سے اس وقت بھی مالا مال تھی۔

داغ چھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاتل
ہاتھ بھی دُکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے

۱۷۵۷ء میں نواب سراج الدولہ کی شکست کھانے اور ہلاک ہونے کے بعد راجہ رام نارائن موزوں نے بھی تڑپ کر کہا تھا کہ

آہ وہ صحرا نورد دیوانے عاشق کہاں گئے
اور وہ ایام عاشقی کہاں معدوم ہوگئے

مرزا مظہر جانِ جاناں صوفی شاعر تھے۔ انھوں نے ۱۷۸۱ء میں شہادت پائی۔ ان کے مکتوبات میں احمد شاہ ابدالی کے حملے کا بھی ذکر ہے اور روھیل کھنڈ کے سیاسی مسائل پر تبصرے بھی۔ اشعار میں کئی ایسے ہیں کہ اشاروں کی نقاب سے بھی یہ حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے کہ ان میں سیاسی واقعات کے حوالے دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی وہ غزل پیش کی جاسکتی ہے جس میں انھوں نے اپنے عہد کو غلامی کا عہد قرار دے کر اس عہد میں سانس لینے اور زندگی گزارنے کی تمنا کا اظہار کیا ہے جو آزادی کی نعمت سے مالا مال ہو۔ مطلع ہے:

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

میر و مصحفی کی شاعری میں بھی ان شاعروں کے عہد کے سیاسی سماجی حالات پر تبصرے اور تاریخی واقعات کے حوالے موجود ہیں۔ میر نے درد میں ڈوب کر ہی یہ شعر کہا ہوگا جو سننے والوں کو بھی درد سے معمور کردیتا ہے۔ یہ شعر ایک شعر نہیں، ہندوستان کی تاریخ کا مکمل باب ہے:

دل کی ویرانی کا تو مذکور کیا
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

مصحفی نے تو بقول مجنوں "جن کا کلام ماضی کی یادگار، حال کی کشاکش اور مستقبل کے میلانات کا اشاریہ ہے" کرب میں ڈوب کر کہا تھا کہ

ہندوستاں نمونۂ دشت بلا ہے کیا
جو اس زمیں پہ تیغ ہی چلتی ہے اب تلک

مصحفی کا ایک اور شعر بہت مشہور ہے۔

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

یہ شعر عام طور سے اسی طرح نقل ہوتا رہا ہے مگر سید ابوالخیر کشفی نے مصحفی کے ''دیوان چہارم'' کے حوالے سے اس شعر کو جس طرح نقل کیا ہے اس میں بجائے ''ہندوستاں کی''، ''اسلامیوں میں'' استعمال ہوا ہے یعنی

اسلامیوں میں دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

جس زمانے میں یہ شعر کہا گیا اس زمانے تک قومیت کا جدید تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسلامیوں کی اصطلاح ان مسلمان دیسی حکمرانوں کے لیے استعمال ہوئی جنھیں شکست دے کر فرنگیوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا۔ اس لیے یہ اصطلاح بیک وقت ملی احساس سے بھی ہم رشتہ ہے اور قومی احساس سے بھی۔

جابر حکمرانوں اور حملہ آوروں سے نبرد آزمائی کی اس شعری روایت کے پس منظر میں یہ پوچھنا فطرت کے عین مطابق ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے بہادر شاہ ظفر اور غالب کی شاعری کو کس طرح متاثر کیا یا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا مشاہدہ کرنے والے شاعروں کی شاعری کے رنگ و آہنگ کو کس طرح دوسرے اردو شاعروں کی شاعری کے رنگ و آہنگ سے مختلف قرار دیا جاسکتا ہے؟ اس کی تلاش کے دوران عجیب و غریب حقیقتیں اور مثالیں سامنے آتی ہیں۔ یہ باعث تعجب بھی نہیں کیونکہ مورخین بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بارے میں متضاد بیانات دیتے رہے ہیں۔ اس کو شروع شروع میں بلکہ ۱۰۰ سال تک غدر، بغاوت، شورش کہا جاتا رہا لیکن اب مطلع صاف ہو رہا ہے۔ اس حقیقت پر اصرار بڑھ رہا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جو ہوا وہ غدر، شورش یا بغاوت نہیں تھی، عوامی جنگ تھی، آزادی کی لڑائی تھی، ملک کو آزاد کرانے کی تڑپ نے سپاہیوں، دستکاروں، کسانوں اور عام لوگوں کو فرنگی حکمرانوں کے خلاف صف آراء کردیا تھا۔

اردو شعر و ادب میں شروع شروع میں اس کی صحیح تصویر کشی نہیں ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کس نے کیا؟ اس کو بیشتر تخلیق کاروں نے قہر الٰہی، فریب تقدیر، آسماں کی چشم بد، اعمال بد کی سزا اور انقلابِ زمانہ کا نام دیا اور اس کا ماتم کرتے رہے۔ بہتوں نے سپاہیوں کی بغاوت کی مذمت کی۔ شاعروں کی بڑی تعداد کا اندازِ فکر یہی تھا کہ سپاہیوں کی بغاوت کی وجہ سے ان پر اور دلّی پر مصیبت آئی۔ اس دور کے ایک شاعر قاضی فضل حسین

افسردہ نے یہی بات اپنی ایک مناجات میں کہی ہے۔

ہائے کیا دہلی پہ آفت آگئی　　چین سے بیٹھے تھے شامت آگئی

سر پہ عالم کے مصیبت آگئی　　فوج کیا آئی قیامت آگئی

افسردہ کے یہ اشعار اس حقیقت کا ثبوت تو ہیں ہی کہ جنگ آزادی کی حقیقت اور وسعت کو اس وقت نہیں سمجھا گیا لیکن اس سے ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے کہ سپاہیوں نے میرٹھ سے آکر دلّی شہر میں جو رویہ اختیار کیا اس کا وہاں کے عوام پر برا اثر پڑا۔ استاد ذوق کے ایک شاگرد تشنہ دہلوی نے اسی زمانے میں ''شہر آشوب'' کے عنوان سے ایک مسدس لکھی تھی جس کا ایک شعر ہے

تمام شہر تلنگوں نے آکے لوٹ لیا
مثل ہے بھوکوں کو ننگوں نے آکے لوٹ لیا

''تلنگوں''، ''پوربیوں''، ''سپاہیوں'' جیسے الفاظ عام طور سے ان مسلح فوجیوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں جو میرٹھ سے چلے تھے یا میرٹھ سے دلّی آنے والوں کے شریک کار ہوگئے تھے۔ ان کے طرزِ عمل کی شکایت زیادہ تر شاعروں نے کی ہے لیکن ان کی شکایت صرف سپاہیوں سے نہیں تھی۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ شہر پر نازل ہونے والی آفت کے لیے قلعہ اور اہل قلعہ کو بھی ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ غلام دستگیر مبین نے تمام مصیبتوں کو بداعمالیوں اور گناہوں کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ آزردہ کے مسدس میں انگریزوں کے مظالم کی طرف بھی اشارہ ہے۔ 'اعمالوں' کی اصطلاح بھی بہت وسیع ہے اور اس کو عام طور سے شاعروں نے اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے۔ کنور بشن پرساد فرحت کے مخمس میں دوسروں کے مقابلے ''شہر آشوب'' کے عناصر زیادہ نمایاں ہیں۔ غریبی، بیکاری کے ساتھ انھوں نے ہنرمندوں اور پیشہ وروں کی تباہی کا نقشہ کھینچا ہے اور اس طبقے سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔

کوئی مفلسی میں ہے مبتلا کوئی تنگ حال سے خوار ہے
جسے دیکھو آہ زمانے میں وہ الم سے زار و نزار ہے
کوئی بے کسی میں اداس ہے کوئی رنج کے تہہ بار ہے
ہے کوئی قلق سے شکستہ دل کوئی غم سے سینہ فگار ہے
یہ اٹھائے لوگوں نے غم پہ غم نہ حساب ہے نہ شمار ہے

۱۸۵۷ء کے بارے میں اب جو بات عام طور سے تسلیم کی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ

اس سال عوامی مزاحمت کے سبب ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج ختم ہوا۔ عظیم تر ہندوستان برطانوی تاج کے زیر نگیں آیا اور ایک طرح سے انہیں واقعات نے ملک میں ایسی فضا تیار کی کہ ملک کو آزاد کرانے کی تحریکیں مختلف شکلوں میں اور مختلف سطحوں پر شروع ہوئیں۔

مغل حکومت ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ ان کی برائے نام حکومت کا دائرہ بھی جو پہلے ہی دلّی سے پالم اور پھر لال قلعے تک سمٹ گیا تھا یا اس کی جو علامتی حیثیت رہ گئی تھی ۱۸۵۷ء کے بعد وہ بھی باقی نہیں رہی۔ بہادر شاہ ظفر گرفتار کر کے جلا وطن کر دیے گئے۔ بہادر شاہ سے بہت سے ایسے اشعار منسوب ہیں جو ان کے نہیں ہیں۔ لیکن وہ شاعر تھے ان کے ایک دو نہیں پانچ دیوان میں سے چار دیوان موجود ہیں۔ پانچویں دیوان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ لیکن ان کے پہلے دواوین میں جو اشعار ہیں ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے لیے اگرچہ بڑے سے بڑے القاب استعمال کیے جا رہے تھے مگر وہ خود کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھے۔ انھیں احساس تھا کہ ملک ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے ان کی بادشاہت نام کی ہے اور ان کے انتقال کے بعد لال قلعہ سے بھی ان کی اولاد کو باہر نکال دیا جائے گا۔ ان کے وہ اشعار بھی جو ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کے ہیں، یہ یاد دلاتے ہیں کہ بہادر شاہ ظفر کو غلامی کی جڑوں کے ملک میں گہرائی تک پیوست ہو جانے کا احساس بے چین کیے رہتا تھا۔ وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھے۔

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا　　یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لیے گرچہ بنانا تھا مجھے　　کاش خاکِ درجانانہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو　　عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دل صد چاک بنایا تو بلا سے لیکن　　زلف مشکیں کا تری شانہ بنایا ہوتا
صوفیوں کے جو نہ تھا لائق صحبت تو مجھے　　قابل جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوریٔ ساقی سے مجھے　　تو چراغ درمیخانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

انھیں اس حقیقت کا بھی احساس تھا کہ ان کے ارد گرد انگریزوں کا ہی نہیں ان کے اپنوں میں سے بھی ایسے لوگوں کا ہالہ ہے جو وقت کے ساتھ بدلتے جا رہے ہیں۔

کبھی بن سنور کے جو آ گئے تو بہار حسن دکھا گئے
مرے دل کو داغ لگا گئے وہ نیا شگوفہ کھلا گئے

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیوں کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے
مرے پاس آتے تھے دمبدم، وہ جدا نہ ہوتے تھے ایک دم
یہ دکھایا چرخ نے کیا ستم کہ مجھی سے آنکھیں چرا گئے
جو ملاتے تھے مرے منھ سے منھ، کبھی لب سے لب کبھی دل سے دل
جو غرور تھا وہ انھیں پہ تھا وہ کبھی غروروں کو ڈھا گئے

بہادر شاہ ظفر کی شاعری کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی جاتی رہی ہیں — کبھی یہ مشہور کردیا گیا کہ وہ شاعر ہی نہیں تھے۔ کبھی یہ مشہور کردیا گیا کہ ان کے وہ اشعار جن میں رنج و غم ہے یا ۱۸۵۷ء کے واقعات کا حوالہ ہے۔ بے کسی کا ماتم ہے وہ دوسروں کے لکھے ہوئے ہیں۔ صرف ان کے نام سے مشہور ہوگئے ہیں — لیکن تحقیق کرنے والوں نے ان الزامات کی تردید کی ہے۔ ہمارے عہد کے سب سے بڑے اردو شاعر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے اپنے تحقیقی مضمون میں واضح کیا ہے کہ

'' ظفر کے کلام میں خالص جذبات، شاعرانہ احساس، سوز و گداز اور دل میں چٹکیاں لینے والی اداسی اور ایک درماندگی کا کیف اور کئی جگہ موسیقیت کا جو عنصر ملتا ہے وہ کل کا کل ظفر کا ہے۔''

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ظفر نے جو اشعار کہے وہ سب محفوظ نہیں رہ سکے۔ ان میں دوسروں کے مصرعے اور شعر بھی شامل کردیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ مصرعوں میں توارد بھی ہوا ہے لیکن اس سے اس بات کی تردید نہیں ہوتی کہ ظفر کے کلام کا اپنا تاثر ہے اور اس تاثر میں ۱۸۵۷ء کے واقعات نے اضافہ کردیا تھا — مثال کے طور پر یہ غزل ملاحظہ فرمائیں اس میں ایک دو مصرعوں یا شعروں پر دوسرے شعراء کے دعوے ہوسکتے ہیں مگر مکمل غزل ظفر کی ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے انتخاب کلامِ بہادر شاہ ظفر میں اس غزل کو شامل کیا ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا، مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصل بہار ہوں
نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں، نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں

جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں، جو اُجڑ گیا وہ دیار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آکے شمع جلائے کیوں، میں وہ بیکسی کا مزار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا، مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

بہادر شاہ ظفر کی یہ غزل بھی اسی کیفیت کی ترجمان ہے جس میں وہ مبتلا کردیے گئے تھے۔ اس میں صرف ایک شخص کی بے بسی پر نہیں، ایک پورے عہد اور نظام کی بے بسی پر آنسو بہایا گیا ہے۔ ایک طرح سے پیشین گوئی کی گئی ہے کہ آنے والے دن اور زیادہ خراب ہوں گے:

لگتا نہیں ہے جی مرا اُجڑے دیار میں ۔۔۔ کس کی بنی ہے عالم ناپائدار میں
عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن ۔۔۔ دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
کہدو یہ حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں ۔۔۔ اتنی جگہ کہاں ہے دل داغدار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے ۔۔۔ دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

غالب عظیم ترین شاعر تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء میں زندہ تھے۔ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ہنگامے کے دوران وہ دروازہ بند کرکے روزنامچہ لکھ رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کا استاد ہونے کا بھی انھیں شرف حاصل تھا۔ وہ خاندان مغلیہ کی تاریخ لکھنے پر تو بہت پہلے سے متعین ہوچکے تھے لیکن ان کی شاعری میں ۱۸۵۷ء شعری تجربہ نہیں بن سکا ہے۔ بعد کے لوگوں نے ان کے بہت سے شعروں کے بارے میں کہانیاں گڑھی ہیں مگر وہ تمام شعر ۱۸۵۷ء سے کافی پہلے لکھے جاچکے تھے۔

۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کی شاعری میں ایک شعر اور ایک ۹ شعری قطعے کے علاوہ کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ ۲ فروری ۱۸۵۹ء کو میر مہدی مجروح کے نام خط میں انھوں نے ایک شعر لکھا تھا جو پہلے کا کہا ہوا تھا:

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

ایک ۹ شعری قطعہ بھی انھوں نے ۱۸۵۸ء میں ہی علاء الدین احمد خاں علائی کے نام لکھا تھا

بسکہ فعال مایرید ہے آج ۔۔۔ ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے ۔۔۔ زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے ۔۔۔ گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

شہر دھلی کا ذرہ ذرہ خاک | تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک | آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا | وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ | سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم | ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب | کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

۱۸۵۷ء کے بعد غالب کا اردو دیوان ان کی زندگی میں ہی کئی بار شائع ہوا لیکن اس قطعہ کو کسی دیوان میں جگہ نہیں ملی۔ یہ قطعہ ان کے انتقال کے بعد ۱۸۶۹ء میں ''اُردوئے معلّٰی'' کے ذریعہ پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا۔ ۱۸۵۷ء غالب کا شعری تجربہ کیوں نہیں بن سکا؟ اس کی بہت سی تاویلیں ہوسکتی ہیں مگر ایسے اشعار نہیں پیش کیے جاسکتے جو ۱۸۵۷ء کے واقعات کا حوالہ ہوں۔ ہاں غالب کے کہے ہوئے ۱۸۵۷ء سے پہلے کے ایسے بہت سے اشعار ہیں جن میں انسان دوستی ہے۔ آزادی کا پیغام ہے۔ ظلم سے نفرت کا اعلان ہے۔ یہ قطعہ تو صرف دہلی کی تباہی کا مرثیہ ہے۔ اجڑی ہوئی دہلی کا آئینہ ہے۔

اسی دور کے ایک شاعر منیر شکوہ آبادی تھے جن پر ایک طوائف نواب جان کے قتل کی سازش کرنے کا مقدمہ چلا تھا اور وہ کالے پانی بھیج دیے گئے تھے۔ کالے پانی یعنی انڈمان بھیجے جانے سے پہلے منیر کو باندہ میں قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ باندہ کی قید سے کالے پانی تک کی تکلیفوں کو انھوں نے ان اشعار میں بیان کیا ہے۔ اس نظم کو ۱۸۵۷ء کے واقعات کا مکمل حوالہ کہا جاسکتا ہے۔ فرنگیوں کے دورِ حکومت میں گرفتاری سے قید و جلاوطنی تک ایک ہندوستانی کو جن مشکلات سے دو چار ہونا پڑتا تھا ان اشعار میں وہ سب بیان کردی گئی ہیں:

کوٹھری تاریک پائی مثلِ قبر | تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
بول و غایط کی جگہ بستر کے پاس | تھی نجس تر خانۂ خنزیر سے
بھینس کی سانی سے بدتر دال تھی | سخت دانہ، دانۂ انجیر سے
کالے پانی میں جو پہنچے یک بیک | کٹ گئی قید ستم تقدیر سے

یہ کہی تاریخ ہم نے اے منیر
صاف نکلے ''خانۂ زنجیر سے''
۱۲۷۷ھج

۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک عہد کا خاتمہ اور دوسرے عہد کا آغاز تھا—

ہمارے شاعروں نے اس جنگ آزادی کا جب بھی ذکر کیا ہے اداسی اور افسردگی سے کیا ہے۔ مولانا حالی نے جو غالب کے شاگرد اور سوانح نگار ہیں دتی کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ ایک پورے عہد کا مرثیہ ہے۔ ۱۸۵۷ء میں ہونے والی علم و ہنر کی تباہی کا مرثیہ ہے۔ اہل علم کی ناقدری کا مرثیہ ہے۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب — درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں — نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

بزم ماتم تو نہیں، بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

اردو کے دوسرے شاعروں نے بھی ۱۸۵۷ء کے واقعات کے پس منظر میں دتی کا مرثیہ لکھا تھا لیکن جیسا کہ حالی نے اپنے مقطع میں کہا ہے ان کا مقصد رونا رلانا نہیں تھا۔ وہ ۱۸۵۷ء کی لائی ہوئی تباہی کا حال بیان کرکے ملک و قوم کو انگریزوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تحریک دلانا چاہتے تھے — ان کی کوشش کامیاب ہوئی۔ ہندوستانیوں میں آزادی کا ولولہ پیدا ہوا اور خود اردو شاعری نے نیا رنگ و آہنگ قبول کیا۔

(۴) چوتھی شکل Hogiological Literature یعنی اولیاء امت یا صوفیاء کرام کے ملفوظات و مکتوبات، حکایات و قصص اور احوال و تخلیقات پر مبنی ادب سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ تاریخ کا بہت اہم ماخذ ہے اور اس پر بڑا کام کیا ہے پروفیسر حسن عسکری نے۔ ان کے ایک مضمون کا عنوان ہی ہے

Historical Value of Hagiological Literature

ملفوظاتی ادب کی تاریخی قدر و قیمت

حسن عسکری نے ملفوظاتی ادب پر اصولی بحث کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ بہت سی کتابوں، بیاضوں اور مخطوطوں کا نئے زاویے سے تجزیہ کیا ہے۔ مثلاً ایک مضمون کا عنوان ہے۔

Political and Economic Fragments From Resail-e-Ijaz-e-Khusravi

رسائل اعجاز خسروی کے سیاسی اور معاشی اجزا

Political Significance of the Movement ot Syed Ahmad Bareilvi

یعنی سید احمد بریلوی کی تحریک کی سیاسی اہمیت

مضمون میں اس تحریک کے کئی ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو نگاہ سے اوجھل تھے۔ اس تحریک پر بحث کرنے والوں نے خوب بحث کی ہے مگر مذہب و مسلک کے حوالے سے۔ خالص تاریخی نقطۂ نظر سے پروفیسر حسن عسکری نے جو بحث کی ہے وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے حالات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

A Contemporary Account of the Sack of Delhi by Nadir Shah

یعنی نادر شاہ کے ذریعہ دہلی کے تاخت و تاراج کیے جانے کی عصری تفصیل

بھی ان کا ایک بہت اہم مضمون ہے جس سے ۱۸۵۷ء سے پہلے کی دتّی کی تباہی کا منظر سامنے آتا ہے۔

پروفیسر حسن عسکری کے کچھ اور بہت اہم مضامین و مقالات جن کی روشنی میں ہندوستان کی جنگ آزادی کا پس منظر واضح ہوتا ہے، یہ ہیں :

An Unpublished Letter of Mir Qasim

میر قاسم کا ایک غیر مطبوعہ خط

Some Letters of and Relating to Tipu Sultan

ٹیپو سلطان کے اور ان سے متعلق چند خطوط

Durrani - Rajput Negotiations 1759-1761

درانی - راجپوت گفت وشنید ۱۷۵۹ء - ۱۷۶۱ء

The Nizam and Cornwallis

نظام اور کارنوالس

Hazrat Abdul Quddus Gangohi

حضرت عبدالقدوس گنگوہی

خواجہ حسن نظامیؒ کی ۱۲ کتابیں بھی مثلاً ''غدر کے شام و سحر''، ''غدر کے اخبار''، ''غدر کے فرمان''، ''بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ''، ''محاصرۂ دہلی کے خطوط''، ''بیگمات کے آنسو''، ''انگریزوں کے قصے'' ...... ملفوظاتی ادب کا حصہ ہیں۔ خواجہ صاحب کی نوجوانی میں ایسے لوگ زندہ تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی قیامت دیکھی ہی نہیں جھیلی بھی تھی۔ ان کی بعض کتابیں ان کی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی پر مبنی ہیں۔ اچھا ہوتا کہ علمی اسناد اور حواشی

کے ساتھ یہ کتابیں دوبارہ شائع کی جاتیں۔ طامس مٹکاف کی ڈائری خواجہ صاحب نے منہ مانگا دام دے کر حاصل کی تھی مگر وہ بھی ہمارے سامنے نہیں ہے۔ تحقیق اور حوالے کے ساتھ اس کی اشاعت نو کی بھی ضرورت ہے۔

ان کتابوں میں جو کچھ ہے وہ یقیناً من وعن قبول کیے جانے کے لائق نہیں ہے بلکہ ان میں چھان پھٹک کی ضرورت ہے لیکن جو تفصیلات و واقعات ان میں شامل ہیں ان کے بغیر ۱۸۵۷ء کی سنگینی اور حقیقی نوعیت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں صرف تین بیانات یا واقعات کو نقل کرنے پر اکتفا کیا جارہا ہے۔ یہ بیانات بعض دوسرے ذرائع سے بھی ہم تک پہنچے ہیں مگر تاریخ کی کتابوں میں شامل نہیں ہیں۔

- ''بیگمات کے آنسو'' (ص ۱۳-۱۴) میں ان قیامت خیز حالات کی تفصیل پیش کی گئی ہے جن حالات میں بہادر شاہ ظفر ۱۸ اور ۱۹ ستمبر کی درمیانی رات میں قلعہ معلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے:

''جس وقت میرے بابا جان کی بادشاہت ختم ہوئی اور تاج وتخت لٹنے کا وقت قریب آیا تو دلی کے لال قلعے میں ایک افسوسناک شور مچا ہوا تھا۔ در و دیوار پر حسرت برستی تھی۔ اجلے اجلے سنگ مرمر کے مکان کالے سیاہ نظر آتے تھے۔ تین وقت سے کسی نے کچھ کھایا نہ تھا۔ زینب میری گود میں ڈیڑھ برس کا بچہ تھی اور دودھ کے لیے بلکتی تھی۔ فکر اور پریشانی کے مارے نہ میرے دودھ رہا تھا نہ کسی ...... ہم سب اسی یاس و ہراس کے عالم میں بیٹھے تھے کہ حضرت ظل سبحانی کا خاص خواجہ سرا ہم کو بلانے آیا۔

آدھی رات کے وقت سناٹے کا عالم توپوں کی گرج سے دل سہمے جاتے تھے لیکن حکم سلطانی ملتے ہی ہم حاضری کے لیے روانہ ہوگئے۔ حضور جائے نماز پر تشریف رکھتے تھے۔ تسبیح ہاتھ میں تھی جب میں سامنے پہنچی۔ جھک کر تین مجرے بجالائی۔ حضور نے نہایت شفقت سے قریب بلایا اور فرمانے لگے، کلثوم! لو اب تم کو خدا کو سونپا۔ قسمت میں ہے تو پھر دیکھ لیں گے۔ تم اپنے خاوند کو لے کر فوراً کہیں چلی جاؤ، میں بھی جاتا ہوں۔ جی تو نہیں چاہتا کہ اس آخری وقت میں تم بچوں کو آنکھ سے اوجھل ہونے دوں پر

کیا کروں ساتھ رکھنے میں تمھاری بربادی کا اندیشہ ہے۔ الگ رہوگی تو شاید خدا کوئی بہتری کا سامان پیدا کردے۔

اتنا فرما کر حضور نے دست مبارک دعا کے لیے جو رعشہ کے سبب کانپ رہے تھے، اٹھائے اور دیر تک آواز سے بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے رہے۔

پچھلی رات کو ہمارا قافلہ قلعے سے نکلا، جس میں دو مرد اور تین عورتیں تھیں۔ مردوں میں ایک میرے خاوند مرزا ضیاء الدین اور دوسرے مرزا عمر سلطان بادشاہ کے بہنوئی تھے۔ عورتوں میں دوسری نواب نور محل، تیسری حافظ سلطان بادشاہ کی سمدھن تھیں۔ جس وقت ہم لوگ رتھ میں سوار ہونے لگے صبح صادق کا وقت تھا۔ تارے چھپ گئے تھے، مگر فجر کا تارا جھلملا رہا تھا۔ ہم نے اپنے بھرے پُرے گھر پر اور سلطانی محلوں پر آخری نظر ڈالی تو دل بھر آیا اور آنسو اُمنڈنے لگے۔ نواب نور محل کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور پلکیں ان کے بوجھ سے کانپ رہی تھیں اور صبح کے ستارے کا جھلملانا نور محل کی آنکھوں میں نظر آتا تھا۔''

- تاریخ کی کتابوں سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر لال قلعہ سے ہمایوں کے مقبرہ پہنچے تھے اور وہیں سے انھیں گرفتار کیا گیا تھا۔ مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہمایوں کے مقبرہ تک پہنچنے سے پہلے وہ کہاں کہاں ٹھہرے تھے اور ان کی کس کس سے ملاقات ہوئی تھی؟ اگر کسی کتاب میں اس سلسلے میں بعض اشارات ہیں بھی تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ قلعہ چھوڑنے کے بعد ان کی کیا کیفیت تھی۔ خواجہ صاحب نے اپنی اسی کتاب (ص ۱۰۷ - ۱۰۸) میں یہ تفصیل بھی پیش کردی ہے:

'' میری والدہ ماجدہ بروایت اپنے پدر بزرگوار حضرت شاہ غلام حسن صاحب بیان فرماتی تھیں کہ جس دن بہادر شاہ دہلی کے قلعے سے نکلے تو سیدھے درگاہ حضرت محبوب الٰہی صاحب میں حاضر ہوئے اس وقت بادشاہ پر عجیب مایوسی اور ہراس کا عالم تھا۔ چند مخصوص خواجہ سراؤں اور کہاروں کے سوا کوئی آدمی ہمراہ نہ تھا۔ فکر و اندیشے سے بادشاہ کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور گرد و غبار سفید داڑھی پر جما ہوا

تھا۔ بادشاہ کی آمد سن کر نانا صاحب درگاہ شریف میں حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ مزار مبارک کے سرہانے در سے تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ مجھ کو دیکھتے ہی حسب معمول بشرے کو متبسم کر دیا۔ میں سامنے بیٹھ گیا اور خیریت دریافت کرنے لگا، جس کے جواب میں نہایت طمانیت سے بولے، میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ کمبخت باغی سپاہی کسی کی بات نہیں مانتے ان پر اعتماد کرنا غلطی ہے۔ خود بھی ڈوبیں گے مجھ کو بھی ڈبوئیں گے آخر وہی ہوا کہ بھاگ نکلے۔ بھائی اگرچہ میں ایک گوشہ نشین فقیر ہوں مگر ہوں اس خون کی یادگار جس میں آخر دم تک مقابلہ کرنے کی حرارت ہوتی ہے۔ میرے باپ داداؤں پر اس سے زیادہ برے وقت پڑے ہیں اور انھوں نے ہمت نہیں ہاری مگر مجھے تو غیب سے انجام دکھا دیا گیا ہے۔ اب اس شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں کہ میں تخت ہند پر تیمور کی آخری نشانی ہوں۔ مغلیہ حکومت کا چراغ دم توڑ رہا ہے اور کوئی گھڑی کا مہمان ہے۔ پھر جان بوجھ کر خواہ مخواہ کیوں خوں ریزی کراؤں؟ اس واسطے قلعہ چھوڑ کر چلا آیا۔''

ان مکالمات کے بعد کچھ اسلامی تبرکات درگاہ میں بہ حفاظت رکھے جانے کے لیے پیش کیے اور پھر اپنی بھوک اور پیاس کا ذکر کیا:

'' نانا صاحب سے بادشاہ نے کہا کہ آج تین وقت سے کھانے کی مہلت نہیں ملی اگر گھر میں کچھ تیار ہو تو لاؤ نانا صاحب نے کہا ہم لوگ بھی موت کے کنارے کھڑے ہیں۔ کھانے پکانے کا ہوش نہیں۔ گھر جاتا ہوں جو کچھ موجود ہے حاضر کرتا ہوں، بلکہ آپ خود گھر تشریف لے چلیں جب تک میں زندہ رہوں اور میرے بچے سلامت ہیں آپ کو کوئی شخص ہاتھ نہیں لگا سکتا، پہلے ہم مرجائیں گے اس کے بعد کوئی اور وقت آسکے گا۔ بادشاہ نے فرمایا آپ کا احسان ہے جو ایسا کہتے ہو مگر اس بوڑھے جسم کی حفاظت کے لیے اپنے پیروں کی اولاد کو قتل گاہ میں بھیجنا مجھے کبھی گوارا نہ ہوگا۔ زیارت کر چکا، امانت سونپ دی اب دو لقمے '' محبوبی لنگر''

سے کھالوں تو مقبرہ ہمایوں میں چلا جاؤں گا۔ وہاں جو قسمت میں لکھا ہے پورا ہو جائے گا۔

نانا صاحب گھر آئے، دریافت کیا کہ کچھ کھانے کو موجود ہے؟ کہا گیا کہ بیسنی روٹی اور سرکے کی چٹنی ہے۔ چنانچہ وہی ایک خوان میں آراستہ کر کے لے آئے اور بادشاہ نے وہ چنے کی روٹی کھا کر تین وقت کے بعد پانی پیا اور خدا کا شکرانہ بھیجا۔ اس کے بعد ہمایوں کے مقبرے میں جا کر گرفتار ہوئے۔''

- ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کے قید ہو کر بصد کسمپرسی رنگون بھیج دیے جانے اور ان کے کئی شہزادوں کے قتل کر دیئے جانے کے بعد ان کے خاندان والوں پر کیا گزری یا زندہ بچ جانے والے شہزادوں نے کس حال میں زندگی بسر کی؟ خواجہ صاحب نے اس کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ انھوں نے ۱۹۱۷ء میں دلّی کے ایک اخبار کے دفتر میں ایک مغل شہزادے کو ملازمت کرتے دیکھا تھا۔ اس کا اور ایک دوسرے شہزادے کا حال زار اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کا دل دہل اُٹھتا ہے:

'' شہزادہ محمود آج ایک ایسے مکان میں رہتا ہے جہاں ان کے بڑوں کا ایک کمین سے کمین غلام بھی رہنا پسند نہ کرتا۔ نہ پکی دیوار ہے نہ پکی چھت ہے نہ پکا صحن ہے۔ کچی مٹی کی دیواریں ہیں جن پر کوئلے اور ٹھیکریوں کی بچی کاری ہے اور جن پر بارش کی بوندوں نے خاک کے دروں کو چیر چیر کر گلکاریاں بنائی ہیں۔ شہزادے محمود کو آج وہ کھانا ملتا ہے جو اس کے بزرگوں کے خدمت گاروں نے بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ سوکھی روٹیاں چٹنی سے کھا لیتا ہے۔ وہ اُبلی دال سے پیٹ بھر لیتا ہے اور یہ بھی میسر نہ آئے تو اپنے معصوم بچوں کو تسلی دیتا ہوا فاقے میں پڑ کر سو جاتا ہے۔ شہزادے محمود کے پاس نہ کمخواب کے کپڑے ہیں نہ زربفت کے۔ وہ اور اس کے بچے پیوند لگے کپڑے پہنتے ہیں اور سردی آجائے تو پھٹی ہوئی گدڑیوں اور بوسیدہ کمبلوں کو اوڑھ کر رات بسر کرتے ہیں۔''

خواجہ حسن نظامی نے ایسے شہزادوں کو بھی دیکھا تھا جو زمانے کی گردش کے باعث بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان کی بیان کی ہوئی کہانیوں میں ایک ایسے نابینا شہزادے

کی کہانی بھی شامل ہے جو دلّی کی جامع مسجد کے قریب رہتا تھا۔ پیوند لگا ہوا میلا پاجامہ پہنتا تھا۔ پاؤں میں ٹوٹی ہوئی جوتی ہوتی تھی۔ الجھے ہوئے بالوں پر ایک پھٹی ہوئی ٹوپی رکھی ہوتی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں بانس کی اونچی سی لکڑی اور دوسرے ہاتھ میں مٹی کا پیالہ ہوتا تھا اور اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ کئی مہینے کی بیماری کے بعد آج ہی اُٹھا ہے۔ وہ داہنے پاؤں کو گھسیٹ کر چلتا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کبھی فالج ہوگیا ہوگا۔ یہ فقیر شہزادہ کسی دکان یا کسی شخص کے سامنے نہیں ٹھہرتا تھا۔ اگر کسی راہ گیر یا دکان دار کو رحم آجاتا تو وہ اس کے پیالے میں پیسہ ڈال دیتا۔ فقیر شہزادہ جواب میں صرف یہ کہتا کہ بھلا ہو بابا خدا تم کو برا وقت نہ دکھائے۔ آنکھوں کی معذوری کی وجہ سے وہ دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کو خیرات دینے والا کون تھا۔ خود یہ فقیر شہزادہ کون تھا۔ خواجہ حسن نظامی کے مطابق وہ بہادر شاہ کا حقیقی نواسہ تھا اور اس کا نام مرزا قمر سلطان تھا۔

خواجہ حسن نظامی نے خطوط کی بنیاد پر غالب کا جو روزنامچہ ترتیب دیا ہے اس میں اشخاص، واقعات اور مقامات کے بارے میں جابجا مفید حواشی بھی دیے ہیں۔ وقت کے ساتھ ان اطلاعات کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے جو مرحوم نے حواشی میں بہم پہنچائی تھیں۔ مثال کے طور پر خواجہ صاحب کے نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۰ - ۷۰ سال پہلے حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مزار کہاں اور کس حال میں تھا اور ان کے عہد میں اس میں کیا تبدیلیاں ہوئیں؟

> ”حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مزار پریڈ کے میدان میں جامع مسجد کے شرق کی طرف دو سو قدم کے فاصلے پر کھلے چبوترے پر واقع ہے۔ پہلے چونے کا چبوترہ تھا۔ اب سید عبدالغنی کلیمی سجادہ نشین کی سعی سے سنگ مرمر کی سلیں فرش میں لگائی گئی ہیں۔ یہ علاقہ اب تک فوجی قبضہ میں ہے اور یہاں سایہ کی جگہ بنانے کا حکم نہیں ہے۔ نمازی اور زائر، نماز و زیارت کے وقت دھوپ کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ پہلے یہاں بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ حضرت شیخ کلیم اللہ، سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے بڑے نامور اور صاحبِ تصنیف بزرگ گزرے ہیں۔ تفسیر کلیمی، مرقع، کشکولِ کلیمی، عشرۂ کاملہ۔ مالا بدفی التصوف، مکتوباتِ کلیمی وغیرہ ان کی یادگار کتابیں ہیں۔ حضرت شیخ، یحیٰی مدنی چشتی کے خلیفہ تھے اور

حضرت نظام الدین اورنگ آبادی ان ہی کے خلیفہ اورنگ آباد میں مدفون ہیں۔

میاں کالے صاحب کا نام میاں نصیر الدین تھا، جو میاں قطب الدین صاحب کے بیٹے اور حضرت مولانا فخر الدین صاحب کے پوتے تھے۔ بہادر شاہ ان کی بہت عزت کرتے تھے کیونکہ ان کے والد کے مرید اور دادا کے منظور نظر تھے۔ ملکہ بیگم ایک شہزادی سے انھوں نے نکاح بھی کیا تھا۔ قاسم جان کی گلی میں حکیم اجمل خاں صاحب کے محلّہ سے غرب کی طرف کالے صاحب کی حویلی مشہور ہے، جس میں آج کل پنجابی تاجر دہلی کے رہتے ہیں۔ یہ ان ہی کی تھی اور غدر میں ضبط ہوئی۔ کوتوالی اور سنہری مسجد کے قریب بھی ان کی جائداد کا ذکر غالب نے کیا ہے۔ اب ان کے نواسہ میاں عبدالصمد صاحب پنڈت کے کوچہ میں رہتے ہیں اور دہلی کے فقرا میں مشہور درویش ہیں۔''

(غالب کا روزنامچہ، صفحہ ۳۱ - ۳۰)

غالب کی تحریروں کی وضاحت میں خواجہ حسن نظامی نے متعدد نوٹ لکھے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد بسی بسائی بستیاں اور آباد محلّے کس طرح برباد کردیے گئے :

''پریڈ کے میدان کو دربار ۱۹۱۱ء کے ایام میں جب ہموار کیا جارہا تھا تو سینکڑوں مکانات کے آثار دبے ہوئے نکلتے تھے، یہاں تک کہ چارپائیوں کے پایے، آٹا گوندھنے کے کونڈے اور گھروں کے برتنے کی چیزیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب یہاں کے بازار اور محلّے مسمار کیے گئے تو رہنے والوں کا سامان بھی اس میں دب گیا۔ خیال یہ تھا کہ گنجان محلوں اور بازاروں کا توڑنا، ہوا صاف کرنے کے لیے تھا۔ مگر ۱۹۱۱ء میں یہ نشانیاں دیکھ کر کہا جاتا تھا کہ مسماری جوش انتقام سے تعلق رکھتی تھی۔ جب ہی تو اس بے دردی سے خانہ داری کے اسباب کو بھی ملیا میٹ کردیا گیا اور یہی وجہ ہے کہ غالب جب اس تباہی کا ذکر لکھتے ہیں تو ان کا قلم آنسو بہاتا جاتا ہے۔'' (غالب کا روزنامچہ، ص ۴۲ - ۴۳)

(۵) ۱۸۵۷ء کی تاریخ کے ماخذ کی پانچویں شکل انگریزوں کی رپورٹوں، ڈائریوں، یاد داشتوں، ٹریبونل کے فیصلوں اور انتظامی امور کے متعلق جاری کیے گئے حکم ناموں کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ بہت اہم ذریعہ ہے۔ ماخذ کی یہ شکل ۱۸۵۷ء کی حقیقی نوعیت کو اُجاگر کرتی ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کو احساس تھا کہ وہ ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ان کا اقتدار ریت پر بنے ہوئے محل کی مانند ہے جو کسی وقت بھی ڈھیر ہوسکتا ہے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی کے بارے میں جو باتیں مشہور کی گئی تھیں ان کی تردید عدالت میں علامہ کی درخواست اور مقدمے کے دیگر کاغذات کی روشنی میں ہوجاتی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا امتیاز علی عرشی اور مالک رام نے بہت اہم کارنامے انجام دیے اور عدالت کے کاغذات کی بنیاد پر ثابت کردیا کہ آج تک یہ مانا جاتا رہا ہے کہ:

- مولانا فضل حق مرحوم پر مقدمہ جس میں انھیں بالآخر کالے پانی کی سزا ہوئی، سلطنت مغلیہ کی وفاداری، فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرمِ بغاوت کی بنا پر قائم ہوا تھا۔
- منصف عدالت مولانا کا شاگرد تھا اور وہ چاہتا تھا کہ مولانا بری ہوجائیں۔
- جیوری میں ایک اسیسر بھی مولانا کو بری کردینے کے حق میں تھا۔
- مولانا خود استغاثہ کے بیانات اور دلائل کو ''تارِ عنکبوت'' کی طرح توڑتے جاتے تھے اور اس بنا پر وہ بری کردیئے جاتے، مگر انھوں نے خود اقرار کرلیا کہ جس فتوے کی بنیاد پر مقدمہ قائم ہوا ہے وہ صحیح اور میرا لکھا ہوا ہے۔
- اس اقرار اور اقبال کے بعد عدالت نے ''بیحد رنج وغم کے ساتھ'' مولانا کے لیے کالے پانی کی سزا سنائی۔
- مولانا نے یہ سزا کمال خندہ پیشانی سے سنی

مگر مالک رام صاحب نے مندرجہ بالا تمام دعوؤں کا مقدمے کی اصل مسل کو سامنے رکھ کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ:

۱۔ مولانا نے کبھی ایسا کوئی فتویٰ دیا ہی نہیں تھا جس میں لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہو۔

۲۔ مقدمہ کپتان تھربرن اور اس کے بعد جارج کیمبل اور میجر بارو کی مشترکہ عدالت میں پیش ہوا تھا اور ان تینوں کا مولانا سے شاگردی کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

۳۔ یہ عدالت فوجی قسم کی تھی ایسی عدالت میں جیوری ہوا ہی نہیں کرتی لہٰذا اسیسر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۴۔ مولانا بار بار (مقدمے کے دوران) یہی کہتے رہے کہ میں نے بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

۵۔ جوڈیشیل کمشنر لکھتا ہے کہ مولانا کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے اور انہیں جلا وطن کردینا چاہیے۔ عدالت یہ فیصلہ ''بیحد رنج وغم کے ساتھ'' کیوں سناتی۔

۶۔ جب مولانا نے اپنی پیرانہ سالی اور اپنی اولاد کی صغرسنی اور عسیر المالی کا دردناک قصہ بیان کرکے حکومت سے رحم کی التجا کی کہ مجھے رہا کردیا جائے تو وہاں ''خندہ پیشانی'' سے فیصلہ سننے کا کیا مقام ہوسکتا ہے۔

مالک رام نے ان تمام داستانی باتوں کی تغلیط کے بعد رائے دی ہے کہ:

> '' آج تک ان (مولانا) کی نسبت جو غلط باتیں مشہور رہی ہیں دراصل یہ نتیجہ تھیں ہماری اس خواہش کا کہ ہم انھیں ..... ''جنگ آزادی'' میں بھی برابر کا شریک دیکھنا چاہتے تھے ..... اب کہ حقیقت واشگاف ہوکر ہمارے سامنے جلوہ فروز ہوگئی ہے ہمیں اپنی گذشتہ غلطیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہیے ..... مرحوم کی صحیح عزت اسی میں ہے کہ ہم انھیں (مولانا کو) ان کے صحیح مقام پر بٹھائیں، نہ کہ غلط باتیں ان سے منسوب کرکے ان کا ایک فرضی بت بنائے رکھیں۔ جو ممکن ہے خوبصورت تو ہو لیکن اصل سے اس کا کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوگا....... ''

مالک رام کا مضمون نہایت مفصل ہے جس سے مقدمے کی تفصیلات اور مولانا کے عاجزانہ اور ملتجیانہ بیانات جن میں بار بار بے گناہی جتائی گئی ہے اور رہائی کی درخواست کی گئی ہے، سامنے آجاتے ہیں۔ ارل کیننگ کے نام مولانا کی ایک درخواست بھی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے'' اب میری عاجزانہ درخواست ہے کہ جو کچھ صدر میں اسپیشل کمشنروں کے فیصلے کے خلاف قانون ہونے سے متعلق لکھا گیا ہے اس پر غور کیا جائے۔ مجھے یقین ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خواہ شاہی اعلان کے مطابق انصاف کیا جائے یا ایک پیرانہ سال بوڑھے اور اس کے متعدد بے بس افرادِ خاندان پر رحم کو مدنظر رکھا جائے، بہرحال میری رہائی اور جائداد کی بحالی کے احکام صادر فرمائے جائیں گے۔'' یہ سب تحریریں حکامِ وقت اور مولانا یا ان کے وکیل کے دستخطی ہیں اس لیے ان کی صحت قطعی مشکوک نہیں۔ ان سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ جہاں تک مولانا فضل حق خیر آبادی اور ان کے مقدمے اور مآل کار کالے پانی

کی سزا کا تعلق ہے عام روایتیں نادرست ہیں۔ مقدمے دستخطی کاغذات اور وائسرائے اور گورنر جنرل کے نام مولانا کی درخواست سے ان روایتوں کی نفی ہوجاتی ہے۔

غداروں کے وہ خطوط بھی جو پہلے ہماری دسترس سے باہر تھے لیکن اب منظر عام پر آچکے ہیں، ماخذ کی اسی شکل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی روشنی میں یہ کہنا درست ہے کہ ۱۸۵۷ء کی مسلح عوامی مزاحمت کو اور اس سے پہلے کی انگریزوں کو شکست دینے کی کوششوں کو بھی غداروں کی سرگرمیوں اور کارستانیوں سے ہی ناکام بنایا جارہا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان میں جو بھی جنگ جیتی غداروں اور وطن فروشوں کی مدد سے جیتی۔ جان ولیم نے اپنی کتاب Sepoy War in India میں جولکھا ہے وہ بہت سے انگریزوں نے لکھا ہے:

> ''حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ہماری بحالی کا سہرا ہمارے ہندوستانی پیروکاروں کے سر ہے جن کی ہمت اور جسارت نے ہندوستان کو اپنے وطنوں سے لے کر ہمارے حوالے کردیا۔''

Lawrence Collection, Montgomery Collection, Mutiny Collection, Through the Mutiny کے نام سے جو ذاتی پیپرس عام لوگوں تک پہنچے ہیں ان میں بھی بیش بہا معلومات کا ذخیرہ موجود ہے اور ان کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ انگریز خائف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کا اقتدار محفوظ نہیں ہے۔ انھیں جو بھی کامیابی حاصل ہوئی غداروں اور وطن فروشوں کے سبب حاصل ہوئی۔

غداروں میں صرف ملازمین نہیں، بہادر شاہ ظفر کے قریبی عزیز اور معتمد بھی تھے۔ مرزا الٰہی بخش خاندان تیموریہ کے ایک فرد اور بہادر شاہ کے سمدھی تھے۔ L..P. Griffin نے اپنی کتاب Cheifs & Families of Note in Punjab میں ان کا ذکر شکر گزری کے لہجے میں کیا ہے:

> ''مرزا الٰہی بخش، جن کی خدمات ۱۸۵۷ء میں برطانوی مقاصد کی تکمیل میں بے حد اہم ثابت ہوئیں۔ محاصرۂ دہلی کے دوران دہلی میں رہے اور باغی فوجوں کی نقل و حرکت کے متعلق اہم اطلاعات ہم کو پہنچاتے رہے۔ وہ دہلی میں موجود ہمارے جاسوسوں کی مدد اور حفاظت کرتے رہے۔ انھوں نے دریائے جمنا پر کشتیوں کا پل تباہ کرکے باغی فوجوں کو مشرق سے آنے والی کمک اور امداد کو بند کردیا اور اس طرح ہماری فوجوں کی کارروائی میں بھی عملاً مددگار

ثابت ہوئے۔''

مولوی رجب علی بہادر شاہ کے معتمد، قریبی ساتھی، مشاورتی کونسل کے رکن اور بارود خانے کے داروغہ تھے۔ Cave Brown نے اپنی کتاب Punjab And Delhi 1857 میں ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔ لکھتا ہے :

'' دہلی کا محاصرہ شروع ہوتے ہی میجر ہوڈسن کی سرکردگی میں مخبروں اور جاسوسوں کی تنظیم کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ میجر ہوڈئن نے اپنے ایک پرانے واقف کار مولوی رجب علی سے جو اس سے پہلے ہنری لارنس کے میر منشی رہ چکے تھے رابطہ کیا۔ مولوی صاحب یہ خدمت انجام دینے پر بخوشی تیار ہوگئے اور انھوں نے یہ خدمت ایسی وفاداری اور جوش وخروش سے انجام دی کہ اس کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ وہ دہلی کے عین وسط میں رہتے ہوئے شہر میں موجود باغیوں کے متعلق ہر وہ اطلاع جس کا جاننا ہمارے لیے ضروری تھا، کاغذ کی پرچیوں پر لکھ کر، چپاتیوں کے پروں میں، جوتوں کے تلوں میں، پگڑیوں کی تہوں میں، سکھوں کے بالوں کے جوڑوں میں چھپا چھپا کر ہم تک بھیجتے رہے۔ اس طرح باغیوں کے مورچوں اور منصوبوں کی اطلاح ہمارے کمانڈروں تک بروقت پہنچاتے رہے۔''

مندرجہ بالا اقتباس میں مولوی رجب علی کے کردار کی وہ جھلک ہے جو ایک انگریز نے پیش کی ہے۔ ممکن ہے کسی دل میں خیال آئے کہ انگریزوں نے انھیں بدنام کرنے کے لیے یہ سب لکھا ہوگا اس لیے رجب علی کی ہی کتاب ''تحقیقات چشتیہ'' (باغیچہ رجب علی) سے ایسے حقائق پیش ہیں جو اسی کی زبانی ہیں۔

''تحقیقات چشتیہ'' ایک ضخیم کتاب ہے جو ۱۸۶۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کا اصل موضوع لاہور کی عمارات، باغات اور محلات و دیوانات کی تاریخ و تفصیل بیان کرنا ہے۔ مولف نور احمد چشتی ہیں جنھوں نے کامیابی سے اپنا کام کیا ہے مگر وہ بات نہیں پیدا کرسکے ہیں جو سر سیّد احمد خاں نے اپنی کتاب '' آثار الصنادید'' میں پیدا کردی تھی۔ مولف نے جنگ آزادی (غدر) کا زمانہ دیکھا تھا۔ وہ بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر بھی ہوچکے تھے مگر انھوں نے بہادر شاہ ظفر یا ۱۸۵۷ء کے متعلق کوئی بات نہیں لکھی ہے۔ ضمناً کچھ تفصیلات

البتہ بیان کردی ہیں جو بڑے کام کی ہیں۔ خاص طور سے مولوی رجب علی کے وہ خودنوشت اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے جو مولوی رجب علی نے مولف کی درخواست پر لکھی اور انھیں عطا کی تھی۔

''بعد تسخیر دہلی بحصولِ رخصت وطن آیا۔ جب جارج کارنک، صاحب بہادر، کمشنر ایں روئے ستلج نے رپورٹ، اہل خدمت، کی کی تو پیش گاہ لارڈ کیننگ، صاحب بہادر، گورنر جنرل کشور ہند وائسرائے سے خلعت، پانچ ہزار روپیہ بذریعہ بندگان حضور سر جان لارنس، صاحب بہادر، گورنر جنرل حال مرحمت ہوا اور کچھ جاگیر عطا ہوئی اور خطاب'' ارسطو جاہ'' کا ملا۔ اور خطاب'' خان بہادر'' کا مہم لاہور میں پیش گاہ لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل سابق سے عطا ہوا تھا۔ ۱۸۶۱ء - ۱۸۶۳ء میں براہ سکھر کراچی و بمبئی و عدن''مشرف بہ حج و زیارت'' ہوکر وارد جگراؤں ہوا ....

جناب باری اس دولت انگلیشی کو روز بروز ترقی بخشے کہ طرح طرح کی ترقیات کشور ہندوستان میں'' بہ نیت نیک حکامِ سپہر مقام'' عمل میں آئیں۔ اگرچہ مجھ میں کوئی لیاقت و قابلیت نہیں مگر الحمد للہ، حکام عہد ہمیشہ عزت افزائی میں مصروف رہے ..... چنانچہ اب چارلس ایلیٹ صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر بہت نظر عنایت رکھتے ہیں۔''

حکمرانوں کے جبر اور ان کی حکمت عملی کے سبب تاریخ کے صرف وہی پہلو نمایاں کیے جاتے ہیں جو ان کے عہد کی ظاہری صداقت کو سامنے لاتے ہیں اس لیے تاریخ کے جس حصے کو بہت اہم، مستند اور مصدقہ سمجھا جاتا ہے وہ درحقیقت یک رخی تصویر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ برصغیر کے برطانوی عہد کی تاریخ نویسی کا کام انگریز اور یورپین مورخ ہی کرتے رہے ہیں۔ ہندوستانیوں نے کیا بھی ہے تو انگریزوں کے فراہم کیے ہوئے مواد کی بنیاد پر۔ اس لیے ۱۹۴۷ء تک کی تاریخ برطانوی نوآبادیاتی ذہن کی آئینہ دار ہے۔ نوآباد کار تاریخ کے ایک ایک واقعے کو اپنے مفادات اور تعصبات کی آنکھوں سے دیکھتے اور بیان کرتے ہیں۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء

کے واقعات بیان کرنے میں کچھ زیادہ ہی جانبداری اور تعصب کا مظاہرہ کیا ہے۔

اس کے باوجود ان میں سے بعض نے ایسے بیانات دیے، کتابیں لکھیں یا رپورٹس پیش کیں جن میں انگریزوں کے بے پناہ مظالم کا اقرار و اعتراف کیا گیا ہے تو اس کی وجہ فطرت کا یہ اصول ہے کہ ظالم خود اپنے گناہوں کا ثبوت فراہم کر دیتا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ ان تمام ماخذ کی روشنی میں جن کو مندرجہ بالا پانچ شکلوں میں سمو دیا گیا ہے غالب، بہادر شاہ ظفر اور ۱۸۵۷ء کی جو تصویر اُبھرتی ہے وہ ان تصویروں سے بہت مختلف ہے جو اب تک دیکھی دکھائی جاتی رہی ہیں۔ آج کی اس علمی مجلس میں، میں اسی نئی تصویر کے حوالے سے کچھ باتیں ضرور عرض کروں گا۔ سب سے پہلے غالب کو لیجیے:

غالب یقیناً بہت عظیم شاعر ہیں۔ بجا طور پر ان کی عظمتوں کا اعترف کیا جاتا رہا ہے۔ میں غالب کا عاشق ہوں اور غالب کو صرف اردو کا، فارسی کا، اپنے عہد کا یا برصغیر کا نہیں دنیا کے ہر عہد کے عظیم شاعروں کی مجموعی فہرست میں بھی عظیم تر شاعر تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ غالب اگرچہ اس معنی میں خوش نصیب شاعر تھے کہ انھیں:

- بہت اچھے سوانح نگار ملے مثلاً مولانا الطاف حسین حالی
- زبردست مداح ملے مثلاً عبدالرحمٰن بجنوری، جنھوں نے مقدس وید اور دیوانِ غالب کو ہم پلہ قرار دے دیا۔
- بدترین نکتہ چیں ملے مثلاً یاس یگانہ چنگیزی جن کی غالب شکنی کی روش نے غالب کو اور زیادہ محبوب بنا دیا۔
- بہت اچھے اور بڑی تعداد میں شارح ملے کہ غالب کے کلام کی مکمل، نامکمل شرح کرنے والوں کی تعداد ۴۰ سے اوپر ہے۔

مگر اس معنی میں وہ بدقسمت بھی تھے کہ انھیں اچھے نقاد نہیں ملے۔ نقاد جو نوکِ خار پر قطرۂ شبنم تولنے کا سلیقہ رکھتا ہے، جو شاعر کی ذہنی کیفیت اور سامع یا قاری کے فہم و ادراک کے درمیان کی دوریوں کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو شاعر اور سامع کے بیچ کی دیواروں کو گرا کر سامع کو بھی انھیں کیفیتوں سے ہمکنار کرنے کی کوشش کرتا ہے جن سے سرشار ہو کر شاعر نے شعر کہا تھا۔ غالب کو چونکہ اچھے نقاد نہیں ملے اس لیے آج بھی ان کے بہت سے شعروں کے اصل معنی اور اصل معنی تک رسائی دلانے والی کیفیتیں عام نہیں ہوئی ہیں۔ غالب کا شعر ہے:

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

غالب شناسوں نے اس شعر کے مطلب بتاءے ہیں مگر جب تک اس شعر کے کلیدی لفظ ''جوہر'' کے تمام معنی سامنے نہ ہوں اس کیفیت سے سرشار نہیں ہوا جاسکتا جو اس شعر کا خاصہ ہے۔ افلاطون نے جس حقیقت کو ''الواحد'' شنکر آچاریہ نے برہمن (ذات پات کے معنی میں برہمن نہیں بلکہ آتمن اور برہمن یعنی روحِ انسانی اور روحِ کائنات کے معنی میں) محی الدین ابن عربی نے ''الحق'' اور ہیگل نے ''مطلق'' کہا ہے سپنوزا نے اسی حقیقت کو ''جوہر'' کہا ہے۔ اس تشریح کے بعد وہ پوری کیفیت سامنے آجاتی ہے جس سے سرشار ہوکر شاعر نے دوسرا مصرعہ کہا ہوگا۔

جوہر کا جدید ترجمہ ATOM ہے۔ ہیروشیما، ناگاساکی، عراق، افغانستان کی تباہیاں ذہن میں ہوں تب بھی '' کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا'' کی معنویت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

ایک شعر اور سن لیجیے:

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

شعر میں کوئی مشکل لفظ نہیں ہے۔ ہوا دار کا مفہوم بہت واضح ہے لیکن جب یہ معلوم ہو کہ ''ہوا دار'' کا ایک مطلب جانثار، بہی خواہ اور طرفدار بھی ہے تو معنی کی نئی پرتیں سامنے آنے لگتی ہیں۔ '' ہوادار'' ایک شاہانہ سواری کو بھی کہتے ہیں جو کہار اُٹھاتے تھے۔ اس معنی میں مندرجہ بالا شعر کئی نئی معنوی جہتوں سے ہمکنار ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ غالب اتنے عظیم اور باکمال شاعر ہیں کہ ان کے کمال فن کو ابھی تک پورے طور پر سمجھا بھی نہیں گیا ہے۔

اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی یاد رکھنے کی ہے کہ غالب شاعر کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے ان کے خطوط کا حوالہ پہلے ہی دیا جاچکا ہے۔ '' دستنبو'' بھی لکھی ہے جس کا مقصد انگریزوں سے خلعت، پنشن اور اعزاز حاصل کرنا تھا۔ غالب اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے مگر انھوں نے ثابت کردیا کہ وہ ایسی زبان لکھنے پر قادر تھے جس کو لکھنا تو کیا سمجھنا بھی سب کے لیے ممکن نہیں تھا۔ '' دستنبو'' کے بارے میں غالب نے جو باتیں لکھی ہیں یا اس کو لکھنے کی جو وجہ بتائی ہے اس سے اختلاف رائے کا اظہار ہوچکا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد غالب نے جو مضامین لکھے ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ انگریز ہمیشہ کے

لیے ہندوستان آئے ہیں اور اب یہیں کے ہوکر رہ جائیں گے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکے کہ آزادی ہر شخص اور قوم کا فطری حق ہے اور انگریزوں کو اس ملک سے بھاگنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ ۱۸۵۷ء کے صرف ۹۰ برس اور ان کے انتقال کے صرف ۷۸ برس بعد یہ ملک آزاد ہوجائے گا۔ کیا غالب کو اس کا اندازہ تھا؟

غالب کی ایک اور حیثیت تھی اور اس حیثیت سے بھی غالب کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بارے میں کیا سوچا، کیا لکھا اور اس دوران کیا کہا؟ وہ حیثیت تھی مورخ ہونے کی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ غالب ۱۸۵۰ء میں خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے پہلے تو تاریخ تیموریہ کو امیر تیمور سے شروع کرکے اپنے عہد تک لکھوانے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر اسے بدل کر آغاز آفرینشِ عالم وظہورِ آدم سے شروع کرنے کا حکم دیا۔ اس رد و بدل کے بعد غالب نے تاریخ کا خاکہ دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ پوری کتاب کا نام ''پرتوستان'' رکھا اور پہلے حصے کو جو ابتدائے عالم سے ہمایوں تک کے حالات پر مشتمل تھا ''مہر نیمروز'' کا نام دیا۔ دوسرے حصے کو جس میں اکبر سے بہادر شاہ ظفر تک کے حالات لکھے جانے تھے ''ماہ نیم ماہ'' سے موسوم کیا۔ شاید حکیم احسن اللہ خاں نے مئی ۱۸۵۷ء تک کوئی اور مسودہ مرزا کو نہیں پہنچایا۔ اس لیے '' ماہِ نیم ماہ'' لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ مگر '' پرتوستان'' حصہ اول یعنی '' مہر نیمروز'' ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء/ ۱۸۵۵ء) میں بحکم مرزا فخرو ولی عہد شاہ ظفر فخر المطابع، دہلی سے شائع ہوئی۔

نبی بخش خاں حقیر کے نام ۱۵، ستمبر ۱۸۵۴ء کے ایک خط میں غالب نے اس کا ذکر کیا ہے:

> '' میں نے اب کے عید کو قصیدہ نہیں لکھا۔ ایک مجلّہ اس تاریخ کا تمام کردہ نذر کیا۔
>
> اس کا حال سنیے کہ وہ صورت جو پہلے تھی۔ وہ نہیں رہے گی آغاز امیر تیمور کے حال سے تھا اب شروع تحریر آفرینش عالم و ظہورِ آدم سے ہے۔ میں نے کتاب کا نام ''پرتوستان'' رکھا اور دو مجلد پر منقسم کیا۔ پہلا مجلد ابتدائے عالم سے حضرت نصیر الدین ہمایوں تک اس کا نام '' مہر نیمروز'' رکھا۔ دوسرا مجلد جلال الدین اکبر کے حال سے حضرت والی عصر تک۔ اس کا نام '' ماہِ نیم ماہ'' رکھا۔ سو وہ '' مہر نیمروز'' تمام ہوا اور نذر حضور (بہادر شاہ ظفر)

کیا۔"

مالک رام اور کالی داس گپتا رضا نے "مہر نیمروز" کی توقیت بھی تیار کردی ہے جو مختصراً یوں ہے :

- ۴، جولائی ۱۸۵۰ء : مرزا غالب خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے۔ بہادر شاہ ظفر کا حکم تھا کہ صرف خاندانِ تیموریہ کی تاریخ یعنی امیر تیمور سے حکمرانِ عہد تک کے حالات لکھے جائیں۔
- جنوری ۱۸۵۱ء تک تیمور سے بابر تک کی سرگزشت مکمل ہوئی۔
- مارچ ۱۸۵۱ء کے آخر تک ہمایوں کی جلاوطنی اور واپسی تک کا بیان مکمل ہوا۔
- جون ۱۸۵۲ء تک ہمایوں کے حال کے بعد مرزا نے حکیم احسن اللہ خاں سے کہہ دیا کہ مجھ سے حالات کا انتخاب ممکن نہیں۔ آپ مسودہ اردو میں لکھوا کر میرے پاس بھیج دیا کیجیے، میں اسے فارسی کردوں گا۔ حکیم صاحب نے اسے قبول کیا۔ چنانچہ اسی انداز کا مسودہ مرزا کے پاس بھیجا۔ گویا اب مرزا کو ایک اور کتاب لکھنی پڑی۔ انھوں نے حضرت آدمؑ سے چنگیز خاں تک کے حالات کا مسودہ لکھ کر (کیونکہ یہیں تک کا مسودہ حکیم صاحب نے اردو میں بھیجا تھا) حکیم صاحب کے حوالے کیا۔ اس پر ایک چھوٹا سا دیباچہ لکھا اور عبارت کا انداز بھی بدل دیا۔
- اگست میں کتاب مکمل ہوئی اور
- ستمبر ۱۸۵۴ء عید قرباں کے موقع پر بہادر شاہ ظفر کو پیش کی گئی۔
- فخر المطابع سے حسب الحکم مرزا فخرو ولی عہد ظفر ۱۲۷۱ھ شائع ہوئی۔ (ستمبر ۱۸۵۴ء اور ۱۷، مارچ ۱۸۵۵ء کی درمیانی مدت میں)

منشی شیو نرائن آرامؔ غالب کے شاگرد تھے انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ مہر نیمروز دوبارہ شائع ہو۔ تب تک حالات بدل چکے تھے۔ ان کو غالب نے ۱۸، نومبر ۱۸۵۸ء کو جواب دیا :

> "مہر نیم ماہ نہیں اس کا نام مہر نیم روز ہے اور وہ سلاطین تیموریہ کی تواریخ ہے۔ اب چھپانے کے لائق ہے، نہ چھپوانے کے قابل۔"

غالب کے خط کا آخری جملہ خاص توجہ کا مستحق ہے۔ کیا مورخ کا کام یہی ہے کہ وہ حالات بدلنے کے ساتھ خود بھی بدل جائے؟

اس بات پر بہت اصرار کیا جارہا ہے کہ غالب کلکتہ جانے کے بعد جدید دور کی برکتوں کی طرف مائل ہوئے۔ حقیقت اس بات کو تسلیم نہیں کرتی۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب نے کلکتہ میں چمنی کا دھواں دیکھا، ٹرام دیکھی، صنعتی زندگی کی آپا دھاپی دیکھی مگر جس حقیقت کی ان دیکھی کی وہ یہ تھی کہ بنگال انقلابی تحریکوں کو پروان چڑھانے کی تیاری کررہا ہے۔ بنگالی ادب تخلیقی کرب اور انقلابی فکر و آہنگ کا استقبال کررہا ہے۔ بنگال میں ۱۸۵۷ء کے آخر میں انگریزوں کے خلاف بغاوت شروع ہوگئی تھی اور میرٹھ سے پہلے جس علاقے کے انگریزوں کو فوجوں نے آزمائش میں مبتلا کیا تھا وہ بنگال کا ہی علاقہ تھا۔ اس پس منظر میں غالب کے بارے میں یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ انھوں نے کلکتہ کے چہرے کے صرف غازہ کو دیکھا تھا اور خوش ہوگئے تھے وہ اس شہر نگاراں کے اس تخلیقی کرب کو نہیں دیکھ سکے تھے جس سے انقلاب برپا ہونے والا تھا۔

کیا یہ المیہ نہیں ہے کہ غالب جیسا اعلیٰ دماغ شخص اور شاعر کلکتہ میں چمنی کا دھواں دیکھے، برقی قمقمے دیکھے، تیز رفتار سواری دیکھے اور خوش ہوکر سرسید کو طرزِ کہن پر اڑے رہنے کا طعنہ دینے لگے لیکن خود بنگال کی انقلابی کروٹ کا احساس و ادراک کرنے سے غافل ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ پنشن، منصب اور خلعت کے حصول کے علاوہ عملی زندگی کے کسی اور پہلو پر غالب کبھی بھرپور توجہ نہیں دے سکے۔ وہ پنشن کی طلب میں، اواخر نومبر ۱۸۲۵ء میں عازم کلکتہ ہوئے تھے حالانکہ اس وقت ان کے حقیقی بھائی مرزا یوسف بیگ کی بیماری و دیوانگی کا آغاز ہوچکا تھا اور گھر میں کوئی ایسا مرد نہیں تھا جو ان کی اہلیہ کا خیال رکھتا۔

کلکتہ میں انھیں انگریزوں کی سائنسی ترقیوں کے ساتھ بنگال کے ان طبقات کو دیکھنے کا بھی موقع ملا جو برطانوی حکومت کے زیر اثر پروان چڑھ رہے تھے اور ان کی تمام تر امیدیں یورپ اور انگلستان کے متوسط طبقے کی سیاسی، معاشی اور سماجی شعبوں میں کامیابیوں سے وابستہ تھیں۔ اس امید کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ روشن خیال طبقے کی پشت پر ۴۰ سالہ نو آبادیاتی ''تحریکِ اصلاح'' بھی تھی۔ تحریکِ اصلاح مذہب (ابتداء ۱۸۱۵ء) کے بانی اگرچہ راجہ رام موہن رائے تھے مگر دویندر ناتھ ٹیگور (۱۸۱۷ء - ۱۹۰۵ء) کی قیادت میں یہ تحریک ۱۸۴۳ء تک کامیابی کے پرچم بلند کرتی رہی۔ اسی سے معاشرتی اصلاح کی تحریک نے جنم لیا جس نے ایشور چند ودیا ساگر (۱۸۲۰ء - ۱۸۹۱ء) کی قیادت میں اس وقت نمایاں کامیابی حاصل کی جب ۱۸۵۶ء میں بیوہ کی شادی کا قانون پاس ہوگیا۔

اس طبقہ کے لوگ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے ان جاگیرداروں سے، جو

برطانوی حکمرانوں سے اپنا کھویا ہوا اقتدار چھیننے کی کوشش کررہے ہیں، قانونی اور آئینی حقوق حاصل کرنے کا موقع کبھی نہیں ملے گا جبکہ ان انگریزوں سے جو خود مختار کاؤنسل اور پارلیمنٹ میں عوام کے نمائندے بن کر بیٹھے ہیں، انصاف پروری اور عقل سلیم کا واسطہ دے کر قانون اور آئینی حقوق حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس لیے روشن خیال طبقے نے انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں سپاہیوں کی مسلح مزاحمت کو جس پر مذہبی جذبات کی گہری چھاپ تھی، ایک اتفاقیہ، جاگیردارانہ اور رجعت پسندانہ ہنگامہ سمجھ کر اس کی مذمت کی۔ مگر غالب کی کسی تحریر سے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ انگریزوں کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ ان سے ہندوستانیوں کے لیے حقوق حاصل کیے جاسکتے ہیں انھیں زیادہ سے زیادہ آسائش کے علاوہ انگریزوں سے کچھ بھی عزیز نہیں تھا۔ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ روشن خیال طبقے میں کوئی بھی چھوٹا بڑا شخص ایسا نہیں تھا جو ایک پل کے لیے بھی یہ بھولا ہو کہ حب وطنی بہتر وصف ہے۔ اس لیے عموماً سبھی نے بھارت ماتا کی غلامی اور حملہ آوروں کے ہاتھوں اس کی تباہی کا ماتم کیا ہے مگر غالب کی تحریروں میں ایسا کا کوئی احساس نہیں ہے۔

روشن خیال طبقے کی سرگرمیوں کے دور میں ہی ''ایشور گپت'' جیسے شاعر گزرے ہیں جو اس حد تک انقلاب پسند تھے کہ ان کے نزدیک ''غیر ملکیوں کے دیوتا کے بجائے اپنے وطن کے کتے کو عزیز رکھنا زیادہ بہتر تھا۔'' اور ایسے ہی شاعروں، دانشوروں اور بیدار ذہن لوگوں کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی آخری رات ختم ہونے سے پہلے ہی بنگال کا وہی روشن خیال طبقہ جو پہلے انگریزوں کو اپنے مفادات کا نگراں اور اپنی اصلاحی تحریکوں کا روح رواں سمجھتا تھا، وسطی بنگال کی ''بغاوتِ نیل'' میں بلا تامل کود پڑا اور مظلوم کسانوں کی بہبودی کے لیے پورے جوش وخروش کے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ ہوگیا۔

غالب زندگی کے کسی بھی مرحلے میں ایسی کسی تبدیلی سے دوچار نہیں ہوئے۔ وہ نہ صرف آخری سانس تک انقلابی احساسات سے عاری رہے بلکہ بنگالی ادب کے اس تخلیقی کرب کو بھی محسوس نہیں کرسکے جس میں وہ ۱۸۵۶ء اور ۱۸۶۱ء کے دوران مبتلا تھا۔

غالب انقلابی بنگال کی اس روح کو بھی نہیں پہچان سکے جو بنگال کی انقلابی اور قومی تحریکوں کی محرک بنی، نہ ہی انھوں نے ۱۸۵۷ء کے خاکستر میں چھپی چنگاریوں کی گرمی محسوس کی جو بعد میں دیوبند، ریشمی رومال اور دوسری قومی و انقلابی تحریکوں کی صورت میں شعلۂ جوالہ بن کر غلامی کی زنجیروں کو پگھلا دینے کا سبب بنیں

غالب عظیم شاعر ہیں۔ شاعری میں ان کی عظمتوں کی بنیادیں بہت مستحکم ہیں۔ یہ

کہہ دینے یا تسلیم کر لینے سے ان کی عظمت پر حرف نہیں آئے گا کہ:

- ۱۸۵۷ کے تناظر میں غالب کا رویہ ہندوستانیوں کے لیے ہمدردانہ کم تھا۔ یا
- بہتر سے بہتر زندگی گزارنے کی خواہش ہر انسان کی ہوتی ہے۔ غالب نے بھی اس کی تکمیل میں کچھ ایسے کام بھی کیے جو ان کے چاہنے والے پسند نہیں کرتے۔

اب آیئے بہادر شاہ ظفر کو موضوع گفتگو بناتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر (پیدائش ۱۴، اکتوبر ۱۷۷۵ء۔ علامتی بادشاہت ۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۷ء۔ وفات ۱۸۶۱ء) کو اورنگ زیب کے بعد کے مغل حکمرانوں میں انسان کی حیثیت سے سب سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ انگریزوں اور ان سے قریبی ربط رکھنے والوں تک نے انھیں سراہا ہے۔ چنانچہ Twilight of the Mughal کے مصنف نے ان پر ایک گھناؤنا الزام دوہرانے کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ آخری مغل شہنشاہوں میں سب سے بڑے ہی نہیں سب سے اچھے بھی تھے۔ اسپیرس کے علاوہ منکاف کی بیٹی نے اپنی تصنیف The Golden Calm میں بھی ان کے متعلق ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی بھی انھیں پسند کرتی تھی اس لیے ان کے والد کی مخالفت کے باوجود ان کو ولیعہد پھر بادشاہ تسلیم کیا تھا ظاہر ہے بہادر شاہ کی بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے بارے میں اچھی رائے رہی ہوگی لیکن بعد میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ انگریزوں سے بددل ہوتے گئے یہ بددلی فطری تھی۔ لارڈ ایلین برا کے زمانے تک عید، عیدالاضحیٰ، نو روز اور سالگرہ کے موقعوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ان کی شہنشاہی کے اعتراف کے طور پر جو نذر ملا کرتی تھی وہ بند ہوچکی تھی۔ ادب و مراعات میں مسلسل کمی ہوتی جارہی تھی۔ جواں بخت کو ولی عہد نہ بنوا سکنے کا غم بھی پریشان کیے ہوئے تھا ایسے میں اگر وہ کمپنی سے متنفر ہوئے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں تھی۔ اشاروں کنایوں میں وہ اپنی بددلی کا اظہار اپنے شعروں میں بہت پہلے سے کررہے تھے۔

تسمہ تسمہ کردیا بس کاٹ کر عاشق کی کھال
وہ فرنگی زادِ کلکتہ جو سیکھا ناپنا

(دیوان اول، صفحہ ۳۹)

ہمیں بس بس نہ سمجھاؤ، اٹھو اے ناصحو جاؤ
پڑے ہیں ہم کسی ایسے کہ بس، اب کچھ نہیں چلتی

....

اے اسیرو اب نہ پر میں طاقتِ پرواز ہے
کیا کروگے تم نکل کر دام سے بیٹھے رہو

....

ٹیڑھے جو ہوکے تم سے کہیں وہ کہ اے ظفر
بولو نہ تم کہ ان کے ہیں یہ بانکپن کے دن

....

آخر تو پھر تیغِ ستم کے وار ہمیں پر ہوویں گے
ہوتا ہے گر اور کوئی تو سینہ سپر ہو لینے دو

اس کی ایک اور وجہ بھی تھی اس دور میں جیسا کہ Supression of Mutiny میں Mrs. Henry Duberly نے بھی اعتراف کیا ہے کہ دو تین سو روپیہ میں لوگ جاسوسی کے لیے تیار ہوجاتے تھے۔ قلعہ اور پورے شہر دہلی میں نہ صرف جاٹ مل ایسے پیشہ ور جاسوس موجود تھے بلکہ مرزا الٰہی بخش اور مولوی سید رجب علی کے ایسے منافق بھی یہ کام انجام دے رہے تھے۔ نہیں جاسوسوں اور منافقوں کی طرف ظفر نے ان اشعار میں اشارہ کیا ہے:

ان روزوں اس گلی میں جاسوس جابجا ہیں
کہہ دو کوئی ظفر سے واں آج کل نہ جائے

....

حقیقت کچھ نہ کچھ اپنی ادھر اُڑتی سی پہنچی ہے
کہیں جاسوس کی ان کو خبر اُڑتی سی پہنچی ہے

....

جہاں میں اور تو ڈرتے ہیں غیر سے لیکن
ظفر رہے ہے مجھے اپنے آشنا کا خوف

ادشاہ کے احساسِ بے بسی کا اندازہ کچھ اس شعر سے ہوسکتا ہے:

جو اس کی جان پہ گزرے ہے وہ ہی جانے ہے
خدا کسی کو جہاں میں کسی کے بس نہ کرے

ان کے پاس کوئی اختیار نہیں تھا اس کے باوجود ان کے خلاف سازشیں کی جاتی رہیں اور بالآخر تاج زر ان کے لیے اذیت کا باعث بن گیا۔

شمع محفل نے کہا رو رو کے شب گلگیر سے
کیا وبالِ سر مرا یہ تاجِ زر پیدا ہوا
کہے تھی شب تہ گلگیر شمع رو رو کر
وبال سر پہ مرے تاج زر بنایا تھا

یہ تمام اشعار ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کے ہیں جب وہ دیوانِ اوّل مرتب کررہے تھے۔ لیکن ان شعروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حالات سے کس حد تک واقف تھے اور ان کے دل کی کیا کیفیت تھی اور اس زمانے میں ان کے کہے ہوئے بعض اشعار سے یہ اندازہ بھی کرلیا گیا تھا کہ وہ چشم بصیرت سے آئندہ پیش آنے والے واقعات میں اپنی ذلت کے مناظر دیکھ رہے ہیں۔

مشقِ ستم رہی وہی اس کی کہ جب تلک
ہر استخواں کو میرے نہ قط زن بنایا

اس کے باوجود یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ انگریزوں کے خلاف سازش میں شریک تھے یا مسلح مزاحمت کا منصوبہ انھوں نے بنایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ابتدا میں ۱۱مئی کی صبح کو آٹھ بجے تک بغاوت سے بے خبر تھے۔ انگریزوں کے جاسوس جاٹ مل اور احسن اللہ خاں نے اپنی گواہیوں میں اقرار کیا ہے کہ وہ بادشاہ اور باغی فوج کے لیڈروں کے درمیان خط و کتابت کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ بغاوت کی ابتدائی خبروں کو انھوں نے نہایت غیر سنجیدگی سے لیا۔ وہ باغیوں سے اس بات پر بھی خفا ہوئے کہ انھوں نے ان کا سکون درہم برہم کردیا انھوں نے ان کے لیے ''بدمعاشوں'' کا لفظ بھی استعمال کیا اور آگرے کے لیفٹنٹ گورنر کو خط کے ذریعہ تمام حالات سے باخبر کرتے ہوئے ان سے مدد مانگی۔ ساتھ ہی جب انھیں حالات کی نزاکت کا اندازہ ہونے لگا تو انھوں نے باغیوں اور انگریزوں میں ثالثی کی بھی کوشش کی لیکن ابتدا میں باغیوں کے دباؤ کے تحت اور خوفِ جان سے وہ بغاوت کی سربراہی کے لیے آمادہ ہوگئے اور اکیس توپوں کی ان کی سلامی بھی قبول کرلی لیکن بعد کو جب انھیں اندازہ ہوگیا کہ دہلی میں انگریزوں کی حکومت ختم ہوچکی ہے تو عوام کے منتخب کیے ہوئے ایک حکمراں کی حیثیت سے عوام کی بھلائی اور امن و امان قائم کرنے کے لیے انھوں نے زمامِ حکومت سنبھالنے کا فیصلہ کیا اور سپاہیوں کے دباؤ کے بغیر بھی احکام صادر کیے۔ Trial میں انھیں ''باغی'' اور ''غدار'' کہا گیا ہے لیکن حالات پر غور کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ غدار بہادر شاہ نہیں خود کمپنی تھی۔ جام جہاں نما کی ایک خبر سے پتا چلتا ہے کہ بہادر شاہ کی

تخت نشینی کے موقع پر ریزیڈنٹ طامس مٹکاف نے قلعہ میں ولی عہد کو تختِ سلطنت پر جلوہ افروز کروایا اور ایک سو بیس اشرفیوں کی نذر پیش کی تھی۔ کیا اس کے بعد بھی انھیں بادشاہ کے بجائے کمپنی کی رعایا سمجھنا درست ہے؟ جیسا کہ مقدمہ کے دوران کہا گیا؟ حقیقت یہ ہے کہ پنشن کے ساتھ کچھ آداب و مراعات بھی بادشاہ کو حاصل تھیں مگر انگریزوں نے ان کو ختم کر کے خود ہی اس معاہدے کو توڑا تھا جس معاہدے کے تحت شاہ عالم کو پنشن دے کر کاروبار سلطنت سے سبکدوش کر دیا گیا تھا۔ مغل بادشاہ کا نام شہنشاہ کی حیثیت سے اس وقت تک برقرار رکھا گیا جب تک اس سے انگریزوں کا فائدہ تھا۔ مسلح مزاحمت سے قبل تک انھیں عالی جاہ بھی کہا جاتا رہا لیکن دہلی پر دوبارہ قبضے کے بعد انھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی رعایا اور غدار قرار دے دیا گیا۔ یہی نہیں مختلف تجاویز سے صرفِ نظر کرتے ہوئے انھیں ان کی رعایا کی نظروں میں ذلیل کرنے کے لیے اور مغل شہنشاہ کے قانونی تصور (Image) کو دلوں سے مٹانے کے لیے ان کا مقدمہ لال قلعہ ہی میں پیش کیا گیا۔ انھیں حقائق کے پیش نظر نہ صرف ہندوستانی بلکہ خود بعض انگریز مصنفوں نے لکھا ہے کہ کمپنی کو ان پر مقدمہ چلانے کا حق ہی نہ تھا

حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد مسلح مزاحمت کی رہنمائی قبول کر لی تھی۔ بہت سے وہ کاغذات جو مقدمے میں پیش ہوئے تھے ان کے دفاعی بیان کے اس حصہ کی کسی حد تک نفی کرتے ہیں جس میں انھوں نے کہا تھا کہ وہ باغیوں کے ہاتھوں میں محض قیدی کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے سامنے جو بھی کاغذات پیش کیے جاتے وہ ان پر جان کے خوف سے دستخط کر دیتے تھے یا باغی جو کچھ چاہتے تھے وہ لکھ کر ان کی مہر لگا لیتے تھے۔ ان کاغذات میں بہت سے احکام وہ ہیں جو انھوں نے مرزا مغل یا دوسرے سرداروں کو رعایا کی فلاح و بہبود اور لٹیروں کے ساتھ سختی سے نپٹنے کے لیے جاری کیے تھے۔ ۱۸ جون ۱۸۵۷ء کو مرزا مغل کے نام سے اپنے ایک حکم نامے میں جو مقدمے کے دوران بطور Exhibit No. 13 پیش ہوا انھوں نے کمانڈر ان چیف کو لکھا تھا کہ فوج کا کام حفاظت کرنا ہے نہ کہ لوٹنا اور برباد کرنا۔ لہٰذا فوج کے سردار اپنے سپاہیوں کو ایسی حرکتوں سے باز رکھیں۔

یہاں یہ بات قبل ذکر ہے کہ ایک ہی روز قبل پرانے قلعہ کے رہنے والوں کی عرضداشت پر انھوں نے مرزا مغل کو لوٹ مار روکنے کا نہ صرف حکم دیا تھا بلکہ اس پر فوری عمل نہ ہونے کی وجہ سے مرزا مغل کو دوسرے ہی دن سخت الفاظ میں تنبیہ بھی کی تھی۔ بیاسی

سال کی عمر میں اس قسم کے احکام بادشاہ کی بیدار مغزی اور انتظامی صلاحیت کی گواہی دیتے ہیں جس کا اعتراف بادشاہ کے جانی دشمن جان لارنس، چیف کمشنر پنجاب کو بھی کرنا پڑا تھا۔ اس نے ایک جگہ لکھا ہے:

"The papers referring to the system of the king's government exhibit in a remarkable manner the active personal share which the king himself took in the conduct of the affairs ... It must be admitted that his orders were not unworthy of the situation. He did make an effort to preserve order in the city to repress rapine and murder in the village, check malversation and to restrain the excesses of the soldiery."

اس قسم کے رعایا پرور احکام کے علاوہ جن میں وہ احکام بھی شامل ہیں جن میں عام لوگوں کی عرضیوں پر ان کی حفاظت کے لیے سپاہیوں کی تعیناتی اور گائے کے ذبیحہ پر پابندی (جس کا پورے طور پر نفاذ بھی ہوا) بھی شامل ہیں، ان کی دفاعی بیان کا وہ حصہ صحیح ہے جس میں انھوں نے بغاوت کے ابتدائی دور میں جب انگریزوں کا قتل ہورہا تھا باغیوں کے ہاتھوں اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ ایک رحم دل، شریف الطبع، صوفی مشرب اور جذباتیت کی منزل سے گزر جانے والے بوڑھے انسان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ کسی بھی گروہ کے، خواہ وہ اس کے دشمنوں ہی پر مشتمل کیوں نہ ہو، بچوں اور عورتوں کے قتل عام کا حکم دے۔ کمپنی کے ایجنٹ مسٹر فریزر اور قلعہ دار مسٹر ڈگلس اور دوسرے انگریز بچوں اور عورتوں کے قتل کے سلسلے میں خود کمپنی کے نمک حلال جاسوس جاٹ مل بخت اور سنگھ چپراسی اور غلام عباس اور حکیم احسن اللہ خاں کے بیانات سے ثابت ہے کہ بادشاہ کا نہ تو اس میں ہاتھ تھا اور نہ اسے اس کا علم ہوا۔ اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ بادشاہ نے ان لوگوں کو بچانے کی کوشش کی اور ان کی خواہش کے مطابق دو توپیں اور پالکیاں بھیجیں لیکن اس سے قبل ہی وہ لوگ قتل کیے جاچکے تھے۔

مقدمے میں بادشاہ پر چار الزام لگائے گئے تھے (۱) برطانوی حکومت کے پنشن یافتہ ہونے کے باوجود دس مئی سے یکم اکتوبر تک محمد بخت صوبیدار اور دوسرے افسروں کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کی ترغیب دی۔ اس الزام کا بے بنیاد ہونا اسی بات سے ثابت ہے کہ محمد بخت خاں یکم جولائی کو دہلی پہنچا جب صحیح معنوں میں دہلی انگریزوں سے آزاد ہوچکی

تھی۔ (۲) ۱۰ مئی اور یکم اکتوبر کے دوران بادشاہ نے مرزا مغل کو جو برطانوی رعایا تھے اور دوسرے سپاہیوں اور لوگوں کو حکومت کے خلاف جنگ کے لیے آمادہ کیا۔ اس الزام میں پہلے الزام سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہے صرف بخت خاں کی جگہ مرزا مغل کا نام رکھ دیا ہے۔ ان دونوں الزامات کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ ۱۱ مئی کے پہلے بادشاہ میں اور باغی فوجی کے لیڈروں میں ساز باز تھی لیکن وعدہ معاف گواہوں کے بیانات میں ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی ہے:

(۳) انگریز رعایا ہونے کے باوجود ۱۱ مئی کو یا اس کے بعد ایک غدار کی حیثیت سے اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا اور غدارانہ طور پر دلّی پر قبضہ کرلیا اور اپنے بیٹے مرزا مغل، صوبیدار محمد بخت خاں اور دوسروں کی مدد سے ریاست میں بغاوت کی اور سرکار برطانیہ کو ختم کرنے کے لیے اپنے منصوبوں کے تحت دہلی میں فوج اکٹھا کی اور انھیں انگریزوں سے لڑنے کے لیے بھیجا۔ یہ الزام بھی غلط ہے کیونکہ کسی بھی دستاویز سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بادشاہ نے خود کوئی فوج جمع کی۔ (۴) ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء یا اس کے بعد دلّی کے قلعہ کی حدود میں انچاس یورپیوں کے قتل میں وہ ملوث تھے۔ اور ۱۰ مئی تا یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء انھوں نے باغی سپاہیوں کو یورپین افسروں کو ہلاک کرنے کی ترغیب دی اور باغیوں کو انعامات سے نوازا اور دوسرے دیسی حکمرانوں کو انگریزوں اور عیسائیوں کو قتل کرنے کے احکامات جاری کیے۔ خود انگریزوں کے جاسوسوں اور دوسرے گواہوں کے بیانات سے ثابت ہے کہ انھوں نے انھیں بچانے کی کوشش کی تھی۔ دیسی حکمرانوں سے مدد طلب کرنے کی حقیقت بھی احسن اللہ خاں کے بیان سے کھل جاتی ہے۔

بہادر شاہ کا مقدمہ ایک رسمی کارروائی تھی جس کا مقصد انگریزوں کی ایمانداری اور انصاف پسندی کا پروپیگنڈہ کرنا تھا۔ فیصلے پہلے ہی ہو چکے تھے۔ پہلے یہ طے ہو چکا تھا کہ انھیں قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کی کردار کشی کی جائے گی تاکہ ان کے ہم وطنوں کے دلوں سے ان کا وقار ختم ہوجائے۔ اور ان کے دل و دماغ سے ان کے خاندان مغلیہ کا فرد ہونے کے رشتے سے سلطنت کا جائز وارث ہونے کا خیال نکل جائے۔ یہ خیال عوام کے ذہنوں میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ خواہ وہ مرہٹے ہوں یا جاٹ یا روہیلے یا افغان، کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ خود تخت شاہی پر بیٹھ جاتے۔ وہ اپنے کام شاہی خاندان کے ہی کسی فرد کو تخت پر بٹھا کر اور اسے اپنے قابو میں رکھ کر چلایا کرتے تھے۔ انگریزوں کو اسی اعتقاد کو ختم کرنے کے لیے بہادر شاہ ظفر کو سزا دینی تھی۔ لیکن اس انصاف پسندی کا پول اس وقت کھل گیا جب

شاہی خاندان کے تین افراد مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو دہلی کے دروازے کے قریب لاکر ہڈسن نے گولی ماردی اور اس کے بعد محض شاہی خاندان کے فرد اور لال قلعہ کے مکین ہونے کے جرم میں دوسرے شاہزادوں کو بھی ہلاک کردیا گیا۔ کیا انصاف کا تقاضہ یہ نہ تھا کہ بہادر شاہ کی طرح ان سبھوں پر مقدمہ چلایا جاتا اور مجرم ثابت ہونے کے بعد ہی ان کو سزا دی جاتی۔ کیا ہڈسن کا قانون اپنے ہاتھ میں لینا جرم نہ تھا اور اگر تھا تو اسے سزا کیوں نہیں دی گئی؟ انگریز اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوئے اور اس کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بہادر شاہ ظفر پر شروع سے ہی بدقسمتی کا سایہ تھا مثلاً

- وہ اپنے والد اکبر شاہ ثانی کے ۱۱ بیٹوں میں سب سے بڑے تھے اور دستور کے مطابق انہی کو ولیعہد سلطنت ہونا چاہیے تھا لیکن ان کے والد اپنے تیسرے بیٹے مرزا جہانگیر کو اپنا ولیعہد بنانا چاہتے تھے۔ ۱۸۳۱ء میں مرزا جہانگیر کا انتقال ہوگیا تو اکبر ثانی نے اپنے چوتھے بیٹے مرزا سلیم کو ولیعہد سلطنت بنانے کی کوشش شروع کی۔ بہادر شاہ کے والد اپنے سب سے بڑے بیٹے (بہادر شاہ ظفر) کو ولی عہد کیوں نہیں بنانا چاہتے تھے؟ اس کی جو وجہ بتائی گئی ہے وہ بہت گھناؤنی ہے۔ والد اکبر شاہ ثانی نے بڑے بیٹے بہادر شاہ ظفر پر الزام لگایا تھا کہ شاہ عالم کے زمانے میں اس نے بادشاہ کی ایک بیگم کی عصمت دری کی تھی (ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی غالب اور شاہان تیموریہ میں اس الزام کا ذکر کیا ہے)
- بہادر شاہ ظفر اپنی بیوی نواب زینت محل سے بہت محبت کرتے تھے۔ محبت ہی میں وہ بڑے بیٹوں کے ہوتے زینت محل کے بیٹے مرزا جواں بخت کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے مگر زینت محل لال قلعہ میں نہیں رہتی تھیں۔ الگ حویلی میں رہتی تھیں۔
- بہادر شاہ ظفر کے خاندان کے لوگ اور برادر زادے وغیرہ تو من مانی کرتے ہی تھے مثلاً ان کے خاندان کے جو لوگ لکھنؤ میں رہنے لگے تھے ان کی اجازت کے بغیر کئی کاغذوں پر ان کی مہر لگا کر لے گئے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے مقدمے کے دوران اس کا اعتراف کیا ہے۔
- بہادر شاہ کی اولاد بھی ان کے بس میں نہیں تھی۔ انھوں نے انگریز ریذیڈنٹ بہادر شاہ کی شکایت بھی کی تھی۔ شہزادے پنشن کی رقم لوٹنے کے درپے تھے۔ معلوم ہونے پر بہادر شاہ ظفر نے انگریز حاکموں کو لکھا کہ وہ پنشن کی رقم محافظوں کے ساتھ بجائے لال قلعہ کے قطب صاحب میں ان کی جو حویلی ہے وہاں بھیجیں۔

- قلعۂ معلّٰی سازشوں کا اڈہ بنا ہوا تھا۔ ایک دوسرے کو زہر دیا جارہا تھا۔ الٰہی بخش اور مولوی رجب علی انگریزوں کے مخبر اور تخریب کار تھے۔ ان لوگوں نے قدم قدم پر بادشاہ کو دھوکا دیا اور بالآخر بادشاہ کو گرفتار کروا کے پنشن اور جاگیر حاصل کی۔
- سرسیّد احمد خاں کا خاندان قلعہ معلّٰی سے ہی وابستہ تھا۔ بہادر شاہ ان کو جانتے تھے۔ ۱۸۳۸ء میں جب سرسیّد کے والد کا انتقال ہوگیا اور روزی روٹی کا مسئلہ پیدا ہوا تو لوگوں نے مشورہ دیا کہ وہ قلعۂ معلّٰی چلے جائیں وہاں ملازمت مل جائے گی۔ مگر سر سیّد نے آگرہ کے کمشنر کے دفتر میں نائب منشی کی ملازمت کرلی۔ ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' میں انھوں نے لکھا ہے کہ بہادر شاہ ظفر نادانی کی باتیں کیا کرتے تھے کہ رات ہوتے ہی وہ مکھی مچھر بن کر اُڑ جاتے ہیں اور دنیا جہان کی خبریں لاتے ہیں اس لیے نوجوانی میں انھوں نے قلعۂ معلّٰی سے وابستہ ہونا پسند نہیں کیا تھا۔
- بہادر شاہ ظفر کے خاندان کے لوگوں کو حضرت شاہ فخر الدین کے خاندان سے بڑی عقیدت تھی۔ لال قلعہ کے اکثر لوگ ان کے مرید تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے ان کو بچپن میں دیکھا تھا مگر اتنی گہری عقیدت تھی کہ زندگی بھر ان کا دم بھرتے تھے۔ ان کے سجادہ نشین شاہ غلام قطب الدین تھے بہادر شاہ ظفر ان سے بھی عقیدت رکھتے تھے اور اس عقیدت کا اپنے شعروں میں اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ شاہ فخر الدین کے بارے میں کہتے ہیں۔

کیا خطر اس کو راہِ دیں میں ظفؔر
رہنما جس کا فخر دیں ہوجائے

اے ظفر میں کیا بتاؤں تجھ سے جو کچھ ہوں سو ہوں
لیکن ایسے فخر دیں کے کفش برداروں میں ہوں

شاہ فخر الدینؒ کے سجادہ نشین شاہ غلام قطب الدین کے بارے میں فرماتے ہیں:

مرید قطب دیں ہوں خاکپائے فخر دیں ہوں میں
اگرچہ شاہ ہوں ان کا غلام کمتریں ہوں میں
مجھے تو خانقاہ و مے کدہ دونوں برابر ہیں
ولیکن یہ تمنا ہے کہ ان کا ہوں کہیں ہوں میں
یہی عقدہ کشا میرے، یہی ہیں رہنما میرے

سمجھتا بس انھیں کو اپنا در دنیا و دیں ہوں میں

بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں

ولیکن ان کا بے شبہ گدائے رہ نشیں ہوں میں

حضرت شاہ غلام نصیر الدین صاحبؒ عرف میاں کالے صاحب شاہ فخر الدینؒ کے پوتے تھے۔ بہادر شاہ ان کے مرید باصفا تھے اور اتنی دلی ارادت رکھتے تھے کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ جلیل القدر بزرگ تھے۔ تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ کی دلی میں جب ہر طرف زوال و انحطاط کا تسلط تھا دو مدرسے ایسے تھے جو علم و اخلاق نبوی ﷺ کی روشنی پھیلا رہے تھے۔ ایک مدرسہ رحیمیہ جہاں ایک زبردست انقلابی تحریک کی داغ بیل ڈالی جارہی تھی اور دوسرا اجمیری دروازہ کا مدرسہ جہاں دکن کے ایک نوعمر عالم اقامت گزیں تھے۔ تقریباً نصف صدی قبل اس نوعمر عالم کے والد کو دہلی کے ایک مشہور بزرگ نے دکن میں تبلیغ و اصلاح کے کام کے لیے بھیجا تھا۔ بعد میں ان کے یہ فرزند علم و عرفان کی شمع جلانے کے لیے دکن چھوڑ کر دلی چلے آئے اور دور دور سے لوگ پروانوں کی طرح کھنچ کر ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ اللہ نے ان کو وہ نظر عطا کی تھی کہ جس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھ لیتے وہ ان کا ہوجاتا تھا۔ جب حدیث کا درس دینا شروع کرتے تو سننے والوں پر محویت کا عالم طاری ہوجاتا یہ شاہ فخر الدینؒ تھے۔ ان کے والد شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ، حضرت شاہ کلیم الدین دہلوی کے عزیز ترین مرید اور خلیفہ تھے۔

اگر کوئی شخص کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو بغیر سند نہ فرماتے، نماز جماعت سے ادا فرماتے اور اسی کی تلقین فرماتے۔ معمولی معمولی باتوں میں اتباع سنت کا خیال رہتا تھا۔ ایک مرتبہ کھانے کے لیے بیٹھے تو فرمانے لگے میں جس طرح بیٹھا ہوں حضور ﷺ اسی طرح بیٹھا کرتے تھے۔ پھر لوگوں کو مسواک کی ہدایت فرمائی کہ اس پر حدیث شریف میں بہت اصرار کیا گیا ہے کہ جو شخص خواب سے بیدار ہو اس کو مسواک کرنی چاہیے۔ ایک مرتبہ خوشبو کی تلقین فرماتے ہوئے نہایت محبت آمیز لہجہ میں فرمایا حضور سرورِ کائنات ﷺ کو خوشبو بہت پسند تھی۔

ملفوظات و حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مریدوں کو اتباع سنت و شریعت پر مجبور کرتے تھے اور طرح طرح کے فوائد بیان فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ اپنا قصہ بیان فرمانے لگے کہ جنگ کے دوران میں بارود کے اثر سے آنکھوں کو نقصان پہنچ گیا تھا اور ڈر تھا کہ بصارت بہت کم ہوجائے گی لیکن سرمہ کے استعمال

سے بصارت میں زیادہ کمی نہیں ہوئی۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ سرمہ استعمال کرنا رسول اکرم ﷺ کی سنت ہے۔ حضرت شاہ فخر الدین صاحب نے ۲۷ جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ کو وصال فرمایا اس وقت آپ کی عمر ۷۳ سال تھی۔

حضرت شاہ فخر الدین صاحب کے ایک فرزند تھے ان کا نام غلام قطب الدین تھا وہ دکن میں پیدا ہوئے تھے اور شاہ صاحب دہلی تشریف لائے تو اپنی بہن کے سپرد کردیا۔ غلام قطب الدین صاحب نے ۱۸ محرم ۱۲۳۳ھ کو وصال فرمایا اور حضرت قطب صاحبؒ کے جوار میں آسودہ ہوئے۔ غلام قطب الدین صاحب کے بھی ایک ہی فرزند تھے ان کا نام میاں نصیر الدین عرف کالے صاحب تھا۔ دلّی میں خواص و عوام سب ان کا ادب و احترام کرتے تھے۔ سرسیّد نے لکھا ہے'' اس زمانے میں ایسا نامی گرامی شیخ نہیں ہے حضور والا اور تمام سلاطین و جمیع امراء عظام آپ کے نہایت معتقد ہیں۔'' (آثار الصنادید)

دہلی کا ہر شخص امیر و غریب چھوٹا اور بڑا ان سے ملتا تھا۔ غالب کو ان سے خاص لگاؤ اور اُنس تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

'' میں کالے صاحب کے مکان سے اُٹھ آیا ہوں بلی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرائے کو لے کر اس میں رہتا ہوں وہاں کا رہنا میرا تخفیف کرایہ کے واسطے نہ تھا صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔'' جب میاں کالے صاحب کا انتقال ہوا تو شہر میں کہرام مچ گیا۔ مومن خاں مومن نے تاریخ وفات لکھی۔ مومن خاں کے بارے میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ عامل بالحدیث تھے۔ سرسیّد بھی میاں کالے صاحب کے ہم عقیدہ نہیں تھے مگر ان حضرات نے ان کے بارے میں جو الفاظ لکھے ہیں اس سے میاں کالے صاحب کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مومن خاں کی کہی ہوئی تاریخ وفات یہ ہے :

ہوئی جس دم وفات حضرت کی — مجھ کو تاریخ کا خیال آیا
ہاتف غیب نے کہا ناگاہ — کالے صاحب کو سرخرو پایا

بہادر شاہ ظفر کے اشعار میاں کالے صاحب سے ان کی محبت کی نظیر ہیں :

نظام خانہ فخر جہاں تمہیں تو ہو — قیام سلسلہ و خانداں تمہیں تو ہو
نہ کیونکر تم سے ہوں ظاہر صفات قطب الدین — خدا رکھے تمہیں ان کا نشاں تمہیں تو ہو
تمہارے در پہ جھکا کر سر ارادت خلق — کہے ہے کعبۂ امن و اماں تمہیں تو ہو
نثار تم پہ ہیں پروانہ ساں ہزاروں دل — کہ شمع محفل صاحب دلاں تمہیں تو ہو
تمہاری قوت باطن سے تقویت ہے مجھے — کہ میرے باعث تاب و تواں تمہیں تو ہو

بہادر شاہ ظفر بھی کالے صاحب کی خدمت میں ایک خادم کی طرح حاضر ہوتے اور ان کی خدمت کرتے تھے لیکن بہادر شاہ ظفر کی بدقسمتی کہ ایک وقت ایسا آیا کہ ان کے مرشد جن کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وہ مہاجنوں سے قرض لینے میں بھی تردد نہیں کرتے تھے، ان سے بدظن ہوگئے۔ اس واقعہ کو قلعہ کی ایک بیگم کے حوالے سے ناصر نذیر فراق نے ''لال قلعہ کی ایک جھلک'' (ص ۳۱) میں بیان کیا ہے:

''حضور کو حضرت میاں کالے صاحب سے بیعت تھی اور ایسا اعتقاد تھا کہ میں بیان نہیں کرسکتی بس پیر پرستی کرتے تھے۔ قاسم جان کی گلی میں جو حویلی حضرت کو نذر کی تھی وہ لاکھوں روپے کی تھی جس میں باغ تھا نہر تھی۔ سیکڑوں مکان شاہانہ اس میں تھے حضرت میاں کالے صاحب بھی لال قلعہ جایا کرتے تھے اور بادشاہ سلامت بھی حضرت کے دولت خانہ پر حاضر ہوا کرتے تھے۔

ایک دفعہ بادشاہ سلامت حضرت سے کچھ رنجیدہ ہوگئے حضرت کو کیا غرض پڑی تھی جو لال قلعہ جاتے مگر بادشاہ سلامت بھی اپنی بادشاہت کے گھمنڈ میں سلام کے لیے حضرت کی حویلی میں کئی دن تک حاضر نہ ہوئے۔ آخر بادشاہ سلامت کو خدا نے سمجھ دی اور یہ سمجھے مجھ سے غلطی ہوئی جو میں مرشد کی خدمت میں حاضر نہ ہوا مگر اب چلنا چاہیے، خود مابدولت ہاتھی پر سوار ہوئے حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیر کو ساتھ لیا جب حضرت کے دروازے پر پہنچے تو ہاتھی سے اُترے حکیم صاحب سے کہا کہ رومال سے میرے ہاتھ باندھ دیجیے۔ اتنے میں حضرت کے صاحبزادے میاں غلام نظام الدین صاحب آگئے ان کی عمر اس وقت پانچ چھ برس سے زیادہ نہ تھی بادشاہ سلامت کو دیکھ کر بھولے منہ سے فرمانے لگے ہمارے ابا کے پاس اُلٹے بالوں والے (سکھ) آئے تھی نری اشرفیاں دے گئے ہیں۔ کوٹھری میں ڈھیر لگ رہا ہے بادشاہ سلامت اس بات کو سن کر سُن ہوگئے اور اطلاع کرائی، بہادر حاضر ہے حکم ہو تو روبرو حاضر ہو۔

جواب ملا شوق سے حاضر ہوں۔ جب بادشاہ میاں صاحب کے

سامنے رومال سے ہاتھ باندھے پہنچے تو کہا

بروآمد بندۂ جگر بختہ
آبروے خود بعصیاں ریختہ

اور دھاڑیں مار کر رونے لگے میاں کالے صاحب نے اٹھ کر بادشاہ سلامت کے ہاتھ کھول دیئے اور گلے سے لگا لیا۔ پھر دونوں میں باتیں شروع ہوئیں۔

بادشاہ سلامت: حضور اپنے بڑوں کا صدقہ اس غلام کی خطا معاف کیجیے۔

میاں کالے صاحب: میں نے تمہاری خطا معاف کی اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ میرے اور تمہارے گناہوں کو بخش دے، ابوظفر تم نے جو خیال پکایا تھا کہ غلام نصیر الدین (کالے صاحب کا نام ہے) کے بال بچے لال قلعہ سے پلتے ہیں، یہ تمہارے دماغ کا قصور تھا۔ تمہیں یہ بھید نہیں معلوم کہ جب میں نے تونسہ شریف حاضر ہوکر شاہ سلیمان صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تو حضرت نے فرمایا، دیکھو تم ضرورت سے زیادہ بات نہ کرنا میں نے عرض کی بہت خوب۔ اس دن سے میں برائے نام بولتا ہوں، بلکہ اشاروں سے ہی کام لیتا ہوں پھر ارشاد کیا کہ آنکھیں بند کرو میں نے اپنی آنکھیں بند کیں تو دیکھا میں ایسی زمین پر ہوں جو سونے کی بنی ہوئی ہے اور شاہ سلیمان صاحب کے ہاتھ میں چاندی کا کھرپا ہے وہ کھرپا آپ نے ہاتھ میں دے کر فرمایا سونے کی جس قدر ضرورت ہو اس زمین سے کھود لینا اور خرچ کرنا مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا وہ دن ہے اور آج کا دن اس زمین سے سونا کھودتا ہوں اور گلچھرے اُڑاتا ہوں اس اٹھوارے میں جو تم نہیں آئے کسی نے مجھے چاندی کا روپیہ نہیں دیا بلکہ جس نے دی سونے کی اشرفی دی۔ ایک فوج کی فوج سکھوں کی آئی اور ڈھیر ساری اشرفیاں دے گئی، یہ فرما کر میاں نے نوکر کو اشارہ کیا اس

نے کوٹھری کا دروازہ چوپٹ کھول دیا اور بادشاہ سلامت نے دیکھا کہ کوٹھری اشرفیوں سے پڑی جگمگا رہی ہے۔
بادشاہ سلامت نے یہ تماشا دیکھ کر اپنے جی میں کہا چھوٹے میاں نے ڈیوڑھی پر فرمادیا تھا۔''

مندرجہ بالا واقعے کے علاوہ بھی کئی واقعات سے جن کی تفصیل کتابوں میں موجود ہے ثابت ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر میں بہت سے انسانی اوصاف تھے لیکن ان کے سر پر شروع سے ہی بدقسمتی کا سایہ تھا۔ انھیں ایسی بادشاہت ملی تھی جس کا گزارہ پنشن پر ہوتا تھا۔ جن سے پنشن ملتی تھی وہ بادشاہ کی تضحیک کا کوئی موقع گنواتے نہیں تھے۔ اس کے علاوہ والد، بیوی، وزیر اعظم، سمدھی، معتمد اور بارود خانے کا داروغہ، برادر زادے اور اولاد، آنے جانے والے حتیٰ کہ پیر و مرشد بھی ان سے خوش نہیں تھے۔

بہادر شاہ ظفر کی زندگی کا ابھی اس پہلو سے مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔ غالب اور بہادر شاہ ظفر دونوں ہی ۱۸۵۷ء کے اہم کردار ہیں۔ بہادر شاہ کی حیثیت ''علامت'' کی سی تھی مگر ۱۸۵۷ء میں انھیں ہندوستان میں بسنے والی مختلف مذہبی اکائیوں اور دیسی حکمرانوں کے درمیان ''نقطۂ اتحاد'' کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ وہ خود اس منصب کا حق ادا کرنے اور اس کردار کی ادائیگی کے لیے تیار تھے یا نہیں یا انھوں نے ہندوستان کے سابق سلاطین کی اولاد ہونے کے بجائے ''مستقبل کے حکمراں'' کے کردار کو قبول کیا یا نہیں؟ یہ ایک الگ سوال ہے لیکن اتنا تو طے ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں اور انگریزوں سے برسرِ پیکار عوام کے ایک بڑے طبقے نے انھیں متحدہ ہندوستان کے رہنما کی حیثیت سے قبول کیا تھا۔ اسی طرح غالب نے اگرچہ جھوٹ کہا تھا کہ وہ مسلح مزاحمت شروع ہونے کے بعد روزنامچہ لکھنے میں مصروف ہوگئے تھے لیکن چونکہ وہ قلعۂ معلیٰ سے وابستہ تھے، بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے، شاہانِ تیموریہ کی تاریخ کا ایک حصہ مکمل کر چکے تھے، دوسرا حصہ مکمل کرنے کا وعدہ کر چکے تھے اس لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ غالب اور بہادر شاہ ظفر کے تعلقات کیسے تھے؟

جس وقت بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری عمل میں آئی، اس وقت غالب زندہ تھے۔ اس وقت کے حالات ایسے نہیں تھے کہ کوئی احتجاج کرسکتا یا بہادر شاہ کی گرفتاری کا ماتم کرتا، غالب نے بھی نہیں کیا اس لیے ان پر الزام نہیں دھرا جاسکتا لیکن جب انھیں بہادر شاہ ظفر کے جلاوطنی میں بصد بیکسی مرنے کی خبر ملی تب بھی انھوں نے ایک ڈیڑھ سطر سے زیادہ کچھ نہیں لکھا:

"جمعہ کے دن ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے آزاد ہو گئے۔" (۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء، بنام مجروح)

گویا غالب، بہادر شاہ کی موت کا سرسری ذکر کر کے گزر گئے، یہ نہیں سوچا کہ مرنے والے کے بارے میں وہ اس کی زندگی میں کیا کیا القاب استعمال کرتے تھے۔ کتنے قصیدے کہے تھے۔ اس کے مرنے پر اگر مکمل مرثیہ نہیں لکھ سکے تو کم از کم اپنے پچھلے تعلقات کے حوالے سے اس کے لیے نثر میں ہی دعائیہ جملے لکھ دیں۔

غالب کے بعض اشعار سے شبہ ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر سے ان کے تعلقات بہت مخلصانہ تھے۔ مثال کے طور پر کئی اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اشعار غالب کے بہادر شاہ ظفر سے مخلصانہ تعلق کے نہیں، ان کی موقع شناسی کے گواہ ہیں:

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

پہلا شعر ان کے اس قصیدے کا ہے جس میں انھوں نے بادشاہ سے یہ درخواست کی تھی کہ خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا انھیں جو کام دیا گیا ہے اس کی تنخواہ چھ مہینہ پر نہیں بلکہ ماہ بہ ماہ دی جائے۔ وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ اگر ان کی درخواست منظور نہیں ہوئی تو وہ اس خدمت کو ترک کر دیں گے۔ نبی بخش خاں حقیر کے نام ان کا خط ہے:

"اب چھ مہینے پورے ہو چکے ہیں۔ جولائی سے دسمبر ۱۸۵۰ء تک۔ اب میں دیکھوں یہ ششماہہ مجھے کب ملتا ہے۔ بعد اس کے ملنے کے اگر آئندہ ماہ بہ ماہ کر دیں گے تو میں لکھوں گا ورنہ اس خدمت کو میرا سلام۔" (۱۰ جنوری ۱۸۵۱ء)

دوسرا شعر غالب کی غزل کا ایک مطلع ہے اور اس غزل کا پس منظر بیان کیا جاتا رہا ہے۔ اس کی حقیقت "بیان صفائی" کی سی ہے جو انھوں نے ذوق پر پھبتی کسنے کے الزام

سے برأت کا اظہار کرنے کے لیے دیا تھا۔

تیسرا شعر غالب کی اس غزل کا ہے جو انھوں نے قلعہ کی ملازمت ملنے پر بادشاہ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ بعد میں انھوں نے نواب کلب علی خاں والی رامپور کو لکھا کہ :

''جب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاری سلطان تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر لکھی۔ مقطع اس کا یہ ہے

غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا

اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرتا ہوں خدا کرے کہ حضرت کو پسند آئے۔''

اور غالب نے مقطع کو بدل کر اس کو قطعہ کر دیا۔

در پر امیر کلب علی خاں کے ہوں مقیم
شائستہ گدائی ہردر نہیں ہوں میں
بوڑھا ہوا ہوں قابل خدمت نہیں اسد
خیرات خوار محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں''

مندرجہ بالا تینوں شعروں کے پس منظر سے واضح ہوتا ہے کہ غالب کی ضرورت نے ان سے یہ اشعار کہلوائے تھے۔ ان میں اور بہادر شاہ ظفر میں مخلصانہ تعلقات کبھی نہیں تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے اپنی کتاب '' غالب اور شاہان تیموریہ'' میں غالب کے اردو کلام میں شامل ایسے قصائد، قطعات، رباعیات اور غزلیات کے بعض اشعار کی نشاندہی کی ہے جن کے ممدوح بہادر شاہ ظفر ہیں۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غالب اور بہادر شاہ ظفر میں مخلصانہ تعلقات تھے۔ غالب سے ان کی ضرورت ایسے اشعار کہلواتی تھی۔ یہاں تین مثالیں دی جارہی ہیں :

(الف) غالب نے سب سے پہلے اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ایک شاعر کی حیثیت سے قلعۂ معلّی میں رسائی حاصل کی۔ اس کا ثبوت ۱۸۳۴ء یا ۱۸۳۵ء میں کہا ہوا ان کا وہ قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے کہ

دریں زمانہ کہ کلک رصد نگار حکیم
ہزارو دو صد و پنجاہ راند در تقویم

اکبر شاہ ثانی کے ۱۱ بیٹوں میں بہادر شاہ ظفر سب سے بڑے تھے اور دستور کے

مطابق ولیعہد سلطنت انھیں کو ہونا چاہیے تھا مگر ان کے والد اپنے تیسرے بیٹے مرزا جہانگیر اور مرزا جہانگیر کے مرنے کے بعد چوتھے بیٹے مرزا سلیم کو ولیعہد سلطنت بنانے پر مصر تھے۔ غالب کو خیال گزرا کہ بادشاہ جس کو چاہتے ہیں بالآخر وہی ولیعہد اور پھر بادشاہ ہوگا لہٰذا انھوں نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں لکھے ہوئے قصیدے میں نہ صرف مرزا سلیم کی مدح بھی شامل کی بلکہ یہ لکھا کہ شہزادہ سلیم کی تربیت اس انداز سے کی گئی ہے کہ مغل تخت و تاج کا وارث ہونے کا حق صرف انھی کو پہنچتا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ انگریزوں نے اکبر شاہ ثانی کی خواہش کا احترام نہیں کیا اور دستور کے مطابق یا کسی خاص مصلحت کے تحت بہادر شاہ ظفر کو ولیعہد سلطنت تسلیم کرلیا۔ ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہوا تو دوسرے ہی دن ان کی تخت نشینی کی رسم بھی ادا کردی گئی۔

(ب) غالب نے جو پہلا فارسی قصیدہ دربار شاہی میں پیش کیا وہ وہی ہے جو اکبر شاہ ثانی اور شہزادہ سلیم کی مدح میں ہے اور بہادر شاہ ظفر کی ولیعہدی کے زمانے میں انھوں نے ان کی مدح میں شاید یہی ایک قصیدہ کہا۔ البتہ بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے بعد غالب نے ان کی مدح میں کئی فارسی قصیدے کہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب ''غالب اور شاہان تیموریہ'' میں ان تمام فارسی اردو قصیدوں اور ایسی غزلوں کی نشاندہی کی ہے جو بہادر شاہ ظفر کو پیش کیے گئے تھے یا جن کے مخاطب بہادر شاہ ظفر تھے۔ قاضی عبدالودود، مالک رام اور ڈاکٹر خلیق انجم نے ایک قلمی نسخہ، کلیات غالب سے موازنہ کرکے یہ بھی واضح کیا کہ مطبوعہ قصیدوں میں پانچ قصیدے ایسے ہیں جن کے ممدوح پہلے بہادر شاہ ظفر تھے لیکن بعد کو غالب نے ان قصیدوں میں ضروری ترمیم و تنسیخ کرکے انھیں دوسرے ممدوحین سے منسوب کردیا۔ مثلاً مطبوعہ نسخے میں ایک قصیدہ ہے:

در روزگارہا نتوانند شمار یافت
خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

اس کا عنوان ہے'' سی ام قصیدہ در مدحِ شہنشاہِ انگلستان'' لیکن قلمی نسخے میں اس کا عنوان ہے'' درتہنیت غسل صحت حضورِ اقدس'' مطبوعہ کلیات میں ایک اور قصیدہ سر جارج فریڈرک اڈمنسٹن کی مدح میں ہے اس کا مطلع ہے:

باز پیغام بہار آورد باد

مژدہ بہر روزگار آورد باد

لیکن قلمی نسخے میں اس کا عنوان " درتہنیت نوروز" ہے اور یہ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہے۔ مطبوعہ کلیات میں ایک اور قصیدے کا مطلع ہے:

خیز تا بنگری بشاخ نہال

طوطیانِ زمردیں تمثال

اور یہ جان رسل کالون کی مدح میں ہے اور اس قصیدے کی بیت اسم ہے

اسکوائر کالون کہ درگاہش

اہل دل راست کعبۂ آمال

اسی طرح مطبوعہ نسخے میں ایک قصیدہ نواب وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک کی مدح میں ہے۔ جس کا مطلع ہے:

عیداضحیٰ بسر آغاز زمستاں آمد

وقت آراستن حجرۂ وایواں آمد

مالک رام صاحب کا شبہ ہے کہ یہ بھی پہلے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں لکھا گیا تھا۔ ایک قصیدہ مطبوعہ کلیات میں مہاراجہ نریندر سنگھ والی پٹیالہ کی مدح میں ملتا ہے جس کا مطلع ہے:

سحر کہ بادِ سحر عرضِ بوستاں گیرد

دہد بہ نکہت گل حکم تا جہاں گیرد

قلمی نسخے میں اس قصیدے کا عنوان

" در مدحِ حضرت سراج الدین محمد بہادر شاہِ غازی خلداللہ سلطنتہ"

ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے لفظوں میں " غالب نے دورانِ انقلاب تین قصیدے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہے تھے۔ ایک ۲۶ مئی ۱۸۵۷ء کو عید کے موقع پر، دوسرا ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کو آگرے کی فتح کی خوشی کے موقع پر اور تیسرا ۱۱/ اگست ۱۸۵۷ء کو۔ ان تینوں قصیدوں کا سراغ نہیں ملتا۔ لیکن اس کا تو یقین ہے کہ غالب نے انھیں ضائع نہیں کیا ہوگا۔ ترمیم و تنسیخ کر کے ممدوحین بدل دیے ہوں گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب نے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کم از کم ۲۳ قصیدے ضرور کہے۔ پندرہ وہ جو مطبوعہ کلیات میں شامل ہیں، پانچ وہ جن کے بعد میں عنوان بدل دیے اور تین وہ جو زمانۂ انقلاب میں بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے۔ اس کے

علاوہ شہزادہ جواں بخت کی شادی پر.....''

غالب پر بہادر شاہ ظفر کے لیے سکّہ کہنے کا الزام تھا اور اس الزام میں انھیں محرومیاں ہاتھ لگیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ سکّہ ذوق کے ایک شاگرد حافظ ویران کا لکھا ہوا تھا، بعد میں مالک رام نے ''صادق الاخبار'' کا وہ شمارہ حاصل کر کے غالب کے بیان کی تصدیق بھی کردی لیکن اس سے اس حقیقت کی تردید نہیں ہوتی کہ غالب نے دوسرے سکّے بھی بہادر شاہ کے لیے کہے تھے۔ سکّے کے سلسلے میں ماہرین غالبیات نے جو لکھا ہے اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ لیکن خود غالب نے عبدالغفور سرور (اکتوبر/ نومبر ۱۸۵۹ء) کو ایک خط میں لکھا ہے کہ ان پر ایک نہیں دو سکّوں کے کہنے کا الزام تھا۔ ایک دوسرے خط میں جو نواب یوسف مرزا کے نام ہے (جون ۱۸۵۹ء) غالب کا یہ اعتراف بھی موجود ہے۔

> ''میں نے سکّہ کہا نہیں اور کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اور اگر گناہ ہے بھی تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار بھی اوس کو نہ مٹا سکے۔''

مختصر یہ کہ غالب پر سکّہ کہنے کا جو الزام تھا وہ اس لیے تو غلط تھا کہ جس سکّے کا حوالہ دیا جارہا تھا وہ غالب نے نہیں ذوق کے شاگرد حافظ ویران نے لکھا تھا مگر بادشاہ کے لیے دوسرا سکّہ تو غالب نے ہی لکھا تھا۔ دوسرے قصدے اور اشعار بھی پیش کیے تھے مگر ۱۸۵۷ء کے بعد قصیدہ و اشعار پیش کرنے سے مکر گئے۔

وہ خونیں دور ایسا تھا کہ غالب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتا۔ مگر غالب تو کچھ الگ ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے وہ شروع ہی سے اپنے ممدوح بدلتے رہتے تھے۔

(ج) قصیدوں کی تفصیل میں جیسا کہ کہا جاچکا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی غالب ممدوح بدلنے لگے تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ان کے ممدوحین میں انگریز بھی تھے ۹ نومبر ۱۸۵۵ء میں انھوں نے ایک قصیدہ لارڈ الن برا کو اس درخواست کے ساتھ بھیجا تھا کہ

- اس قصیدے کو ملکہ معظمہ کی خدمت میں پیش کریں۔
- ملکہ معظمہ کی طرف سے انھیں خطاب عطا ہو اور
- ان کی موجودہ خلعت و پنشن میں اضافہ کیا جائے۔

یہاں جو مثالیں دی گئی ہیں ان سے بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ ممدوح بدلنا، ایک کی

مدح میں کہا ہوا قصیدہ دوسرے ممدوح کو پیش کرنا اور ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی انگریزوں کی مدح کو اپنا وطیرہ بنالینا غالب کا شیوہ تھا۔ انھوں نے یہی نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد بہادر شاہ سے اپنے تعلق کا انکار کیا جو شاید وقت و حالات کے مطابق ضروری بھی تھا لیکن بہادر شاہ ظفر کے انتقال کی خبر پر انھوں نے جو ایک ڈیڑھ سطر لکھنے پر اکتفا کیا، اس سے اس تعلق خاص پر حرف آتا ہے جو بہ ظاہر غالب کو بہادر شاہ ظفر سے تھا۔

یہی نہیں کہ غالب نے بہادر شاہ کے گرفتار ہونے اور جلا وطن کیے جانے سے پہلے ہی انگریزوں سے تعلقات استوار کرلیے تھے بلکہ انھوں نے غداروں اور وطن دشمنوں سے بھی بڑے اچھے تعلقات پیدا کرلیے تھے۔ مثال کے طور پر مولوی سید رجب علی کا نام پیش کیا جاسکتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے پس منظر میں جو شخص سب سے زیادہ قابل نفرت اور ملک دشمن نظر آتا ہے وہ یہی مولوی رجب علی ہے۔ اپنی چرب زبانی سے اس نے شاہی بارود خانے کا داروغہ بننے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ لال قلعہ بلکہ دلّی میں اس کے جاسوس پھیلے ہوئے تھے اور وہ ان خبروں کو انگریزوں تک پہنچاتا تھا۔ غالب کے اس سے بہت پہلے سے تعلقات تھے۔

صاحب بزمِ غالب (عبدالرؤف عروج) نے مولوی رجب علی کا احوال ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

> ''.......... رجب علی ۱۸۰۶ء میں ضلع لدھیانہ کے ایک قلعہ تلونڈی میں پیدا ہوئے تھے۔ جب ان کی عمر دس برس کی ہوئی، ان کا خاندان وہاں جگراؤں منتقل ہوگیا۔ جس کے بعد ۱۸۱۸ء میں وہ حصولِ تعلیم کے لیے لاہور بھیجے گئے۔ جہاں انھوں نے حکیم سید خیر شاہ لاہوری اور حکیم ملا مہدی خطائی سے مختلف علم و فنون میں استفادہ کیا۔ بعد ازاں ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج میں داخل ہوکر وہیں ریاضی کے مدرس ہوگئے، لیکن ان کی یہ مدرسی زیادہ دنوں نہیں چلی، انھوں نے مدرسی کو ترک کرکے ہوشنگ آباد اور پھر بھوپال کا قصد کیا اور محکمہ فتاویٰ شرعیہ میں ملازم ہوگئے۔ ۱۸۳۳ء میں اچانک بھوپال کا قیام ترک کے وطن کی راہ لی اور سردار فتح سنگھ کے مصاحبوں میں شامل ہوگئے۔ اسی کے چار ماہ بعد ان کو جان رسل کلارک نے انبالہ میں اپنا منشی بنالیا۔ ۱۸۵۳ء میں انگریزوں

نے ان کی بہتر کارکردگی سے متاثر ہوکر جگراؤں کے کچھ علاقے
بطور جاگیر دیے۔ اسی دوران ہنری لارنس کے ساتھ راجپوتانہ کا
بھی دورہ کیا۔" (صفحہ ۱۶۱)

دوسری تفصیلات کی روشنی میں بھی یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ مولوی سید رجب علی انگریزوں کے پٹھو تھے اور ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے ملکی قومی مفاد کے خلاف کام کررہے تھے مگر غالب کو مولوی سید رجب علی سے بڑی محبت تھی۔ انھوں نے اپنی اس محبت کا اظہار بھی کیا ہے مگر اس کو مذہبی رنگ عطا کرکے۔ جوہر سنگھ جوہر کے نام ان کے ۲۷ اپریل ۱۸۴۷ء کے ایک فارسی خط کا حاصل یہ ہے کہ تمہارے (جوہر سنگھ جوہر کے) کہنے پر ایک دیوان (فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء) تمہیں بھیجتا ہوں۔ اسے میری طرف سے مولانا (سیّد رجب علی) کی خدمت میں پیش کرنا اور میری ارادت کا ذکر کرنا ....
اب تمہیں اس دیار میں در در ٹھوکریں کھانے کی ضرورت نہیں۔ اس کو خوش بختی سمجھو اور مولوی رجب علی کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہو۔ قسم خدا کی یہ یگانۂ روزگار عالی حوصلگی اور انسانیت میں پروردگار کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے افسوس کہ تم نے ان کی گفتارِ شاہوار سے کچھ بطورِ تحفہ مجھے نہ لکھ بھیجا۔ تمہیں میری سوگند کہ جب یہ خط ملے، پڑھنے کے بعد ایک رومال میں لپیٹ کر مولوی صاحب کے پاس لے جانا اور میرا سلامِ شوق پہنچانا اور اسے ان کی نظر سے گزارنا۔ وہ میرے خط کا لفظ لفظ پڑھیں تاکہ انھیں معلوم ہو کہ مجھے ان سے کس درجہ ارادت و عبودیت ہے .... تم نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب حضرت علی کے ماننے والے ہیں، تو اس بات نے گویا مجھے ان کا بندۂ بے دام بنا دیا۔ میں بندۂ علی بن ابی طالب ہوں اور جو ان کا بندہ ہے اسے میں اپنا خداوند سمجھتا ہوں اور اس کی بندگی میں اپنی جان دے دیتا ہوں۔

یہاں ایک بات پر اصرار ضروری ہے کہ غالب نہ تو مخبر تھے نہ ہی کسی کو نقصان پہنچانے کے ارادے سے وہ کسی سے ملے ہوئے تھے، معاملہ صرف یہ تھا کہ اچھی سے اچھی زندگی گزارنے کی خواہش میں وہ اچھے برے کی تمیز نہیں کرتے تھے بلکہ جس سے کچھ ملنے یا جس کے توسط سے حکمرانوں تک پہنچنے کی امید ہوتی تھی وہ اس کی مدح کرنے لگتے تھے۔ غالب کو احساس ہوچکا تھا کہ بہادر شاہ ظفر کی حیثیت ٹمٹماتے دیے کی سی ہے جو کسی وقت بھی بجھ سکتا ہے اس لیے وہ ۱۸۵۷ء کے بہت پہلے سے ہی انگریزوں اور انگریزوں کے پٹھوؤں کی مدح کرنے لگے تھے۔ انھیں اس کی پرواہ نہیں تھی کہ ان کے ممدوحین کے عزائم کیا

ہیں یا یہ کہ ہر حملہ آور کی طرح انھیں ایک دن ہندوستان سے بھاگنا پڑے گا۔ غالب نے انگریزوں کے بارے میں جو رائے قائم کی وہ ادھوری اور یک رُخی تھی۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستانی سپاہیوں اور عام لوگوں کی مسلح مزاحمت ایک عہد کا خاتمہ اور دوسرے عہد کا آغاز تھی۔ جو لوگ اس کو صرف ناکامی اور تباہی سے تعبیر کرتے ہیں انھیں یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ۱۸۵۷ء کے ہی نتیجے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ ہوا۔ ملکہ برطانیہ نے اختیارات اپنے ہاتھ میں لینے کے ساتھ جھوٹے ہی سہی، کچھ وعدے بھی کیے۔ ۱۸۵۷ء نہ ہوتا تو انگریزوں کو اس حقیقت کا احساس ہی نہ ہوتا کہ ان کے خلاف ہندوستانیوں کے دلوں میں کتنا شدید لاوا پک رہا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کی تاریخ بتاتی ہے کہ اگر یہ کچھ روز اور باقی رہ جاتی تو اور زیادہ تباہی ہوئی ہوتی۔ ابتدا میں یہ جوائنٹ اسٹاک کمپنی تھی جو بعد میں ایک دوسری تجارتی کمپنی (Association of Merchants) سے الحاق کرکے East India Company بنی۔ یہ نہ صرف تجارتی حقوق کی حامل تھی بلکہ India in 1858 کے مصنف آرتھر ملس (Arthur Mills) کے مطابق اس کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ حکومت برطانیہ کے مجرموں کو ہندوستان پہنچاتی رہے۔ اس کمپنی نے ہندوستان میں انگریز مجرموں کو داخل کرکے اور پھر ان کی مدد سے مجرمانہ کاروائیاں انجام دیں۔ مختصراً ۱۷۵۷ء کی پلاسی کی جنگ اور اس کے بعد ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی کے بعد صلح نامہ الہ آباد کے تحت کمپنی نے مغل شہنشاہ سے بہار، بنگال اور اُڑیسہ کی دیوانی دو لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ یا چھبیس لاکھ روپے سالانہ کے عوض حاصل کرلی لیکن اپنی مرضی کے خلاف شاہ عالم (پیدائش ۱۷۲۷ء۔ تخت نشینی ۱۷۶۹ء۔ وفات ۱۸۰۶ء) کے الہ آباد سے دہلی واپس آنے کے منصوبوں کو بہانہ بنا کر اس پنشن کو پانچ سال کے بعد ہی ختم کردیا۔ ۱۷۶۵ء میں شجاع الدولہ کا دوست بن کر اسے روہیلوں سے لڑوا کر روہیلہ طاقت کو بھی کمزور کردیا۔ اگرچہ وقتی طور پر روہیل کھنڈ کا کافی بڑا علاقہ شجاع الدولہ کو مل گیا لیکن دوسری ہی نسل میں آصف الدولہ کے ہاتھوں جہاں خود اس کی ماں کو لٹوایا گیا وہیں یہ غصب ہوا کہ وہ علاقہ اس کٹھ پتلی حکمرانوں سے لے کر کمپنی کے دائرۂ عمل میں شامل کرلیا گیا۔ میسور کی چوتھی لڑائی کے اختتام پر ۱۷۹۹ء میں مرہٹوں اور نظام کو سبز باغ دکھا کر ہندوستان کے نہایت دور اندیش حکمراں ٹیپو سلطان کو ختم کردیا گیا اور عظیم سلطنت خداداد کے حصے بخرے کرکے ایک چھوٹی سی ریاست میسور قائم کردی گئی۔ ۱۸۰۱ء میں کرناٹک کو ہڑپ لیا گیا۔ ۱۸۰۲ء میں مراٹھا سردار پیشوا سے چھیڑ چھاڑ شروع کی گئی اور رگھوبا کی مدد

کر کے چند سال قبل تک ہندوستان کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرنے والے پیشوا کو اپنا ماتحت بنا لیا گیا۔ اور اس کے بعد ہی ہولکر، سندھیا، گائیکواڑ اور راجہ برار کو آرتھر ملس کے قول کے مطابق طاقت یا فریب کاری سے اپنا مطیع بنا لیا گیا۔ ۱۸۰۳ء میں دہلی کو مرہٹوں سے آزاد کرانے کے بہانے لارڈ لیک نے دو آبے میں داخل ہوکر ۱۶ ستمبر ۱۸۰۳ء کو دتی پر قبضہ کرلیا اور شاہ عالم کو سندھیا کے پنجوں سے نجات دلا کر ایک لاکھ سے کچھ زیادہ پنشن مقرر کردی۔ اس کے بعد شاہ عالم سلطنت کے بکھیڑوں سے بے نیاز ہوکر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء کو راہیٔ ملک عدم ہوا۔ شاہ عالم نے اپنی کمزوریوں کے باوجود جن میں ان کی حسن پرستی بھی شامل تھی پہلی مرتبہ انگریزوں کی مرضی کے خلاف الہ آباد سے دہلی واپس آنے کا حوصلہ دکھایا اسے اس جسارت کا خمیازہ چھبیس لاکھ سالانہ پنشن کی ضبطی کی شکل میں بھگتنا پڑا اس کے باوجود اس نے انگریزوں کی اس تجویز کو کہ مغل شہنشاہ لال قلعہ کو چھوڑ کر مونگیر میں اقامت اختیار کرے گا، ٹھکرا کر غیرت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کہا کہ مغل شہنشاہ چاہے وہ نام کا ہی کیوں نہ ہو لال قلعہ میں ہی رہے گا۔ اس طرح انھوں نے نہ صرف لال قلعہ کے اندر اپنی آزادی برقرار رکھی بلکہ اس تاریخی جگہ کو ہندوستان کی عظمت اور آزادی کی علامت بنائے رکھا۔ شاہ عالم کے جانشین اکبر شاہ ثانی اس سے بھی زیادہ نااہل ثابت ہوا جس کے نتیجہ میں ولی عہد کے تقرر کا حق بھی اس سے چھین لیا گیا۔ ان سیاسی ریشہ دوانیوں کے ساتھ ساتھ اسی زمانے میں مذہبی کارروائیاں بھی شروع کردی گئیں اور کمپنی کی حکمرانی کی ہوس سقوط دہلی پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس نے نیپال اور برما تک اپنی سلطنت وسیع کرلی۔

امارت کو برباد کرنے کے ساتھ کمپنی کی طرف سے عوام کے استحصال کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ بنگال کے دستکاروں کے انگوٹھے کاٹنے کے بعد استمراری بندوبست کی شکل میں کاشتکاروں کے پیٹ پر بھی لات ماری گئی اور ٹھیکیداروں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں لایا گیا جس کا کام بیدردی کے ساتھ کسانوں کو لوٹنا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی اقتصادیات کو درست کرنے میں اعانت کرنا تھا۔ پیشہ ور فوجی بھی کمپنی کی پالیسیوں کا شکار ہوئے۔ Subsidiary Alliance کے تحت دیسی ریاستوں کے ہزاروں سپاہی بیکار ہوگئے جنھیں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے مجبوراً لوٹ مار کو پیشہ بنانا پڑا اور جنھیں تاریخ میں ٹھگ اور پنڈاری کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ اقرار کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مذکورہ فتوحات میں ہندوستانیوں پر مشتمل فوج کا بڑا حصہ شامل تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں حق نمک کو

زیادہ اہمیت حاصل تھی اور انگریزوں نے اس سے پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے خود ہندوستانیوں کو ہی اپنا نمک خوار بنا کر ہندوستان پر قبضہ کیا۔ والیانِ ریاست کے پیش نظر صرف اپنا ذاتی مفاد رہا کرتا تھا۔ سوائے ٹیپو سلطان کے کوئی بھی اپنی کوتاہ نظری کے باعث انگریزوں کے خطرے کو محسوس نہیں کر سکا۔ انگریز تھوڑے سے فائدہ کا سبز باغ دکھا کر والیانِ ریاست کو ایک دوسرے سے لڑا دیا کرتے تھے۔

ہندوستان کی تاریخ کو غلط ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے اور اس کی وجہ ایک تو یہی ہے کہ انگریزوں نے حالات کو اس طرح لکھوایا تھا جو ان کے مفاد کے مطابق ہو۔ بعد میں ان لوگوں کی اولاد نے بھی جن کے بزرگوں نے انگریزوں اور انگریز دوستوں کی ملازمت کے دوران ہندوستانیوں پر قہر ڈھائے تھے اپنے بزرگوں اور ممدوح شخصیتوں کو بچانے کے لیے غلط فہمیوں کو ہوا دی۔ ہندوستان کی تاریخ کا اگر معروضی انداز میں جائزہ لیا جائے تو دو باتیں سامنے آتی ہیں:

- ایک تو یہ کہ انگریز ایک عرصے سے ہندوستانیوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر اپنا اُلو سیدھا کر رہے تھے اور جیسے جیسے ان کے قدم ہندوستان میں مضبوط ہوتے جا رہے تھے ایسے لوگوں کی تعداد اور ان سے ان کا ربط بڑھتا جا رہا تھا جو معمولی سے معمولی فائدے کے لیے بھی اپنی سلطنت، ملک اور معاشرے کو تباہ کرنے پر آمادہ تھے۔ دلّی کے لال قلعہ سے ہندوستان کی چھوٹی سے چھوٹی ریاست کے والی و زمیندار کی حویلی تک کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں ان کے مفاد کا تحفظ کرنے اور ان کے ایماء پر ہندوستان کے مستقبل کو گروی رکھنے والے لوگ نہ ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی
- جیسے جیسے انگریزوں کا تسلط بڑھ رہا تھا، لاشعوری طور پر ہندوستان میں ایسے لوگوں اور جماعتوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی تھی جو سب کچھ کھو کر بھی وطن کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ اس لیے ہندوستان ایک عرصے سے انگریزوں کو شکست اور دیش نکالا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ۱۷۵۷ء میں اس کوشش کا بہت کامیاب مظاہرہ ہوا۔

انگریزوں کو دیس نکالا دینے اور ملک کو آزاد کرانے کی کوشش کرنے والوں کے ذہنوں میں الگ الگ تصورات تھے۔ تنظیم بھی نہیں تھی، وسائل بھی نہیں تھے اور پھر انگریزوں اور انگریز دوستوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ کرنے والوں میں بھی اپنے مخبر اور تخریب کار شامل کر دیئے تھے۔ مخبر اور تخریب کار نہ ہوتے تو عدم تنظیم اور سامان حرب کی کمی کے باوجود ہندوستانی ہی کامیاب ہوتے۔ مثال کے طور پر تاریخ وار کچھ واقعات پیش

کیے جا رہے ہیں۔ ان کی روشنی میں جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ

- ۱۸۵۷ء کے سو سال پہلے ہی سے ہندوستان لاشعوری طور پر انگریزوں کے خلاف جنگ کی تیاری کر رہا تھا۔
- ۱۸۵۷ء میں افراتفری تھی اس کے باوجود ہندوستان کے طول و عرض میں ہی نہیں، دلّی کے محاذ پر بھی انگریزوں کو شکست ہو رہی تھی۔ اس شکست کو انگریزوں کے ہندوستانی جاسوسوں اور ایجنٹوں نے فتح میں تبدیل کیا اور وہ اس طرح کہ انھوں نے کبھی پل اڑا کر، کبھی بارود خانوں اور توپوں کو تباہ کر کے، کبھی حملے کی پیشگی خبر سے انگریزوں کو خبردار کر کے اور کبھی مسلح مزاحمت کرنے والوں میں اختلاف پیدا کر کے انگریزوں کی مدد کی۔

مرزا الٰہی بخش اور مولوی سید رجب علی جیسے لوگ نہ ہوتے اور بہادر شاہ ظفر نے جنرل بخت خاں کی بات مان لی ہوتی تو ان کا بھی وہ حشر نہ ہوتا جس سے وہ دوچار ہوئے۔ بہادر شاہ اور شہزادوں کی تباہی میں جتنا ہاتھ انگریزوں کا ہے اس سے کم ذمہ داری اہل قلعہ اور انگریزوں کے ہندوستانی مخبروں کی نہیں ہے۔

مجموعی طور پر ۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ناکامی کی علامت نہیں ہے۔ اس سال ایسٹ انڈیا کمپنی کا زوال ہوا۔ نام کے لیے سہی مگر نئی حکومت برسر اقتدار آئی اور موج تہہ نشین کی حیثیت سے ہی سہی مگر کئی مذہبی، سیاسی اور انقلابی تحریکوں کی صورت گری کی تیاری ہوئی۔ جلد ہی ان تحریکوں کا دائرۂ عمل ہندوستان سے بیرون ہند تک پھیل گیا۔ ہندو مسلم اتحاد اور متحدہ ہندوستانی قومیت کے اسی جذبے کا جس کا مظاہرہ ۱۸۵۷ء میں ہوا تھا دوبارہ احیاء کانگریس اور خلافت تحریک کے اتحاد کی صورت میں ہوا لیکن شاطر انگریزوں نے اپنے ہندوستانی مخبروں اور ایجنٹوں کے ذریعہ اس جذبۂ اتحاد کو بھی اسی طرح تباہ کر دیا جس طرح ۱۸۵۷ء میں کیا تھا۔

اس تجزیے کی بنیاد وہ واقعات ہیں جنھیں ترتیب سے پیش کیا جا رہا ہے:

- ۲۳، جون ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں انگریزوں کی فتح کے ساتھ ہی ہندوستان پر انگریزی عملداری کا آغاز ہو گیا۔
- ۱۷۶۰-۱ء میں پانی پت کی جنگ ہوئی۔
- ۱۷۶۳ء میں انگریزوں کے ظلم و جبر کے خلاف فقیروں اور سنیاسیوں کی تحریک شروع ہوئی جس کی قیادت مجنوں شاہ کر رہے تھے۔ انگریزوں کو کئی مقامات پر ان

فقیروں اور سنیاسیوں نے شکست دی۔

- ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ جیتنے کے بعد انگریزوں نے بنگال، بہار، اُڑیسہ کو پوری طرح سے اپنے چنگل میں لے لیا۔
- ۹۲ - ۱۷۹۰ء میں اور پھر ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان نے انگریزوں سے فیصلہ کن جنگ کی۔ پہلے اس کی آدھی سلطنت پر انگریزوں نے قبضہ کیا اور پھر ان کو شہید کر کے پوری سلطنت کے حصے بخرے کر دیے۔
- ۱۸۰۳ء میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے فتویٰ دیا کہ پورا ملک نصرانیوں کے قبضے میں چلا گیا ہے اور اب ان کے خلاف جہاد فرض ہے۔
- ۱۸۰۶ء میں ویلور میں ہندوستانی فوجوں نے مسلح بغاوت کی۔ انگریزوں نے اس مسلح مزاحمت کو ۱۸۵۷ء کا ریہرسل کہا ہے۔ وہ اتنے خوف زدہ ہو گئے تھے کہ بھری ہوئی پستول سرہانے رکھ کر سوتے تھے۔ اسی سال اکبر شاہ ثانی کی نام نہاد تاجپوشی ہوئی۔
- ۱۸۱۸ء میں کٹک میں مسلح بغاوت ہوئی۔ ۱۸۱۸ء اور ۱۸۲۷ء کے درمیان الگ الگ علاقوں میں الگ الگ انداز سے صف بندی ہوتی رہی ان میں سب سے مضبوط صف بندی سید احمد بریلوی کی تحریک کی شکل میں تھی جو ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ یہ تحریک انگریزوں کے خلاف تھی اس لیے انگریزوں نے اس کے خلاف شدید غلط فہمیاں پیدا کی ہیں لیکن مولانا غلام رسول مہر اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے واقعات کو جس طرح پیش کیا ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سید احمد شہید کی تحریک انگریزوں کے خلاف تھی۔ سید صاحب نے امیر خاں پنڈاری کی ملازمت چھوڑی ہی اس لیے تھی کہ اس نے ان کے مشورے کے خلاف انگریزوں سے صلح کر لی تھی۔ بہار و بنگال کے سرحدی علاقوں میں فرائضی تحریک نے بھی بہت شدت اختیار کر لی تھی۔
- ۱۸۴۲ء میں انگریزی فوجوں کو کابل میں زبردست شکست ہوئی۔
- ۴۹ - ۱۸۴۸ میں سکھوں کے خلاف انگریزوں کی جنگ اور پنجاب پر قبضہ
- جنوری ۱۸۵۶ء میں لارڈ کیننگ گورنر جنرل ہوا۔
- فروری ۱۸۵۶ء۔ ہندوستانی سپاہیوں کا چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار۔
- ۲۵، فروری ۱۸۵۷ء۔ بہرام پور میں نیٹو (Native) انفنٹری کی ۱۹ویں رجمنٹ نے

بغاوت کی۔

- مارچ ۱۸۵۷ء : ملک کے مختلف حصوں میں چپاتیوں کی پراسرار تقسیم شروع ہوئی۔
- ۲۹، مارچ ۱۸۵۷ء : بیرکپور میں منگل پانڈے نے مزاحمت کی اور نتیجے میں اس کا کورٹ مارشل ہوا۔
- ۳۰، مارچ ۱۸۵۷ء : نیٹیو (Native) انفنٹری کو منگل پانڈے کی حمایت میں احتجاج کرنے کے سبب ۱۹ویں رجمنٹ سے نکال کر نہتا کردیا گیا۔
- ۳، اپریل ۱۸۵۷ء : منگل پانڈے کو بیرکپور میں پھانسی دیدی گئی۔
- ۲۱، اپریل ۱۸۵۷ء : منگل پانڈے کے دوست اور ساتھی ایسری پانڈے کو بھی پھانسی دے دی گئی۔
- ۲۹/۳۰، اپریل ۱۸۵۷ء : انبالہ میں ہندوستانی فوجوں کا اضطراب اور انگریزی بیرک میں آتشزدگی کی وارداتیں ہوئیں۔
- ۳، مئی ۱۸۵۷ء : لکھنؤ میں ساتویں اریگولر کیولری نے بغاوت کی۔ اس کے نتیجے میں ان سے ہتھیار واپس لے لیے گئے۔
- ۶، مئی ۱۸۵۷ء : بیرکپور میں نیٹیو انفنٹری کی ۳۴ویں رجمنٹ نے بھی بغاوت کی اور ان سے بھی ہتھیار لے لیے گئے۔
- ۱۰، مئی ۱۸۵۷ء : میرٹھ میں ہندوستانی فوجوں نے بغاوت کی۔
- ۱۱، مئی ۱۸۵۷ء : بریلی بریگیڈ کے سپاہیوں نے میرٹھ میں بغاوت کے بعد صبح ۷ بجے دہلی پہنچ کر شاہی قلعے کے دروازوں پر پہرہ لگا دیا۔ حکیم احسن اللہ خاں نے بادشاہ کی طرف سے آگرہ کے چیف کمشنر کے ذریعے، گورنر جنرل کو اطلاع دی۔ لیفٹیننٹ وِلّھبی (Willoughby) نے اسلحہ خانہ کی مورچہ بندی کرکے توپوں کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ وِلّھبی نے اسلحہ خانہ کو بارود سے اُڑا دیا۔ شاہی فوج اور باغی سپاہیوں کے تقریباً پندرہ سو افراد ہلاک اور اس سے زیادہ زخمی ہوئے۔
- ۱۲، مئی : شہر میں افراتفری اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔ تلنگوں نے نواب حامد علی خاں کو انگریزوں کو پناہ دینے کے الزام میں گرفتار کیا مگر بادشاہ کے وزیر محبوب علی خاں کی سفارش پر رہا کردیا۔ منادی میں اسی دن سے خلقت، خدا کی .... ملک بادشاہ کا، حکم سرکار کمپنی بہادر کا، کے بجائے حکم بادشاہ کا جاری ہوا۔
- ۱۳، مئی : شہر میں لوٹ مار جاری رہی۔ نرائن داس نہر والے کا گھر فرنگیوں کو پناہ

دینے کے جرم میں لوٹ لیا گیا۔

- ۱۴، مئی : شہر میں لوٹ مار جاری رہی۔ کچھ دیر کے لیے صرف چند دوکانیں کھلیں۔
- ۱۵، مئی : شہر میں اسلحہ اور بارود کی تلاش شروع ہوئی۔
- ۱۶، مئی : شہر میں موجود انگریزوں کو قتل کیا جانے لگا۔
- ۱۸، مئی : شہر کی فصیلوں اور سلیم گڑھ کے قلعے کو مضبوط کر کے ان میں مورچہ بندی کی گئی۔ سیپرز اینڈ مائیزز کی رجمنٹ باغیوں کی مدد کے لیے دہلی پہنچی۔
- ۱۹، مئی : شہر کے مسلمانوں نے شاہی مسجد اور کشمیری دروازے پر اسلامی پرچم لہرا کر جہاد کا اعلان کیا۔
- ۲۰، مئی : بہادر شاہ ظفر نے شہر کے انتظام کے لیے شہزادوں کو مختلف عہدوں پر متعین کرنے کے علاوہ شہر کے ساہوکاروں کو بلا کر جنگ کے مصارف کے لیے پانچ لاکھ روپے قرض لیے۔
- ۲۴، مئی : شہر میں بازار اور دوکانیں دوبارہ کھلنا شروع ہوگئیں البتہ کچھ علاقوں میں لوٹ مار جاری رہی۔
- ۲۲، مئی : بادشاہ اور شہزادوں نے شاہی مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کی۔ نیٹو (Native) انفنٹری کی نویں رجمنٹ باغیوں کی مدد کے لیے دہلی پہنچی۔
- ۲۳، مئی : باغی فوج کا ایک دستہ خزانہ اور اسلحہ لینے کے لیے رہتک روانہ ہوا۔ بادشاہ نے فرمان جاری کیا کہ شہریوں سے لوٹا ہوا سامان واپس کر دیا جائے ورنہ مجرموں کو سخت سزا دی جائے گی۔
- ۲۴، مئی : بادشاہ نے مرزا مغل کو کمانڈر انچیف مقرر کر دیا اور شہزادوں اور امراء کے ساتھ ہاتھیوں پر بیٹھ کر شہر کا گشت کیا۔
- ۲۵، مئی : بادشاہ نے شاہی قلعے کی مسجد میں نمازِ عید ادا کی۔ عیدگاہ میں کسی نے افواہ اُڑا دی کہ انگریزی فوج آ پہنچی، لوگ افراتفری میں اپنے گھروں کی طرف بھاگے۔ بادشاہ نے معین الدین حسن خاں کو شہر کا کوتوال اور محبوب علی خاں کو دیوان مقرر کیا۔
- ۲۶، مئی : بادشاہ نے مرزا مغل کو کمانڈر انچیف کی خلعت عطا کی اور مرزا خضر سلطان، مرزا عبداللہ، مرزا سہراب ہندی، مرزا بختاور شاہ کو فوج کے مختلف حصوں کے کمانڈر اور مرزا جواں بخت کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ سلیم گڑھ کے قلعے پر نصب کی گئی توپوں میں کسی نے پتھر بھر کر ان کو ناکارہ کر دیا۔

- ۲۷، مئی : فوج نے حکیم احسن اللہ خاں پر انگریزوں سے ساز باز کرنے کا الزام لگایا۔
- ۲۸، مئی : دیوان محبوب علی خاں نے باغی فوج کے افسروں کو طلب کیا اور بادشاہ کا اعلان پڑھ کر سنایا کہ اگر شہر میں لوٹ مار جاری رہی تو انھیں اس کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔
- ۲۹، مئی : حکیم احسن اللہ نے باغی فوج کے افسروں کو طلب کر کے ان کو ڈرایا، دھمکایا اور ان کو میرٹھ جا کر انگریزی فوج کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔
- ۳۰، مئی : صبح پیادہ فوج کا ایک دستہ پانچ سو سوار اور کچھ توپیں لے کر میرٹھ کے لیے روانہ ہوا۔ دریائے ہندو کے پل پر انگریزی فوج ان کا انتظار کر رہی تھی۔ ہندوستانی فوج کو کافی نقصان کے بعد پسپا ہونا پڑا۔ شمال مغربی صوبے سے آئے ہوئے سپاہیوں نے اسلحہ خانے سے اسلحہ لوٹ لیا۔ محاذ پر جا کر جنگ میں حصہ لینے والی فوج کے ساتھ مسلمان مجاہدوں کا ایک دستہ بھی تھا۔
- ۳۱، مئی : دریائے ہندوں کے پل پر ہندوستانی فوج کو شکست۔ شہر کی فصیلوں پر رات بھر گولہ باری ہوتی رہی۔
- ۱، جون ۱۸۵۷ء : قلعے پر رات بھر گولہ باری ہوتی رہی، لوگ قلعے سے نکل کر شہر میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔
- ۲، جون : شہر کے بازار بند رہے۔ انگریزی فوج کی بمباری کو روکنے کے لیے چھاؤنی کے نزدیک پہاڑی پر توپیں نصب کرنے میں انگریز مخالف فوجی کامیاب ہو گئے۔
- بادشاہ نے فرمان جاری کیا کہ سپہ سالار مرزا مغل کی اجازت کے بغیر کسی کو گولہ بارود نہ دیا جائے۔
- ۳، جون : ہریانہ سے اریگولر کیولری کا ایک دستہ ہانسی سے آنے والی فوج کے ساتھ تین لاکھ کا خزانہ لے کر دہلی آ پہنچا۔
- ۴، جون : متھرا سے انفنٹری کا ایک دستہ اور کچھ سوار خزانہ لے کر دہلی آئے۔
- ۵، جون : آگرہ سے تقریباً ایک سو سپاہی دہلی آ پہنچے۔
- ۶، جون : اودھ اور آگرہ سے اریگولر فوج کے کچھ اور سپاہی دہلی پہنچے۔ باغپت کے گوجر انگریزی فوج کو بھیجی گئی رسد سے لدے ہوئے چھکڑے لوٹ کر رات گیارہ

بجے شہر میں داخل ہوئے۔

- ۷، جون : باغی فوج علی پور سے بڑی تعداد میں اونٹ لے کر واپس آئی۔
- ۸، جون : علی پور سے پانچ میل دور بدلی کی سرائے میں جنگ۔ دہلی کے محاذ پر انگریزی فوج کا ہندو راؤ کے مکان پر قبضہ۔
- ۹، جون : زیادہ تر مسلمان سپاہیوں پر مشتمل انگریز مخالف فوج کے دستوں نے انگریزی کیمپ پر دو بجے دن یکے بعد دیگر دو بھرپور حملے کیے۔ جس میں ان کو زبردست جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔
- ۱۰، جون ۔: انگریزی فوج بے حد بددل ہونے کے باوجود قلعہ پر سارا دن گولہ باری کرتی رہی۔
- ۱۱، جون : گوالیار کے انگریز مخالف سپاہیوں کا ایک سوار دستہ انگریزوں سے جاملا۔ میجر مارٹن انگریزی فوج کے لیے اپنی رجمنٹ لے کر پہنچا۔ ہندوستانی فوج کی گولہ باری سے انگریزی فوج کا کافی نقصان ہوا۔
- ۱۲، جون ۔: انگریزی فوج کا مٹکاف کے گھر پر قبضہ۔ ہندوستانی فوج کا فلیگ اسٹاف پر اچانک حملہ۔ انگریزی فوج کا زبردست نقصان۔ کیپٹن نوکس (Knox) مارا گیا۔
- ۱۳، جون : انگریزی فوج کا صبح کے ایک اور دو بجے کے درمیان حملہ کرنے کا منصوبہ تھا مگر تیاری مکمل نہ ہونے کے سبب اِرادہ بدل گیا۔ باغی فوج کا انگریزی فوج پر دوسرا حملہ۔ ان کی کیولری کا دستہ انگریزی کیمپ کے پیچھے پہنچ کر حملہ آور ہوا۔
- ۱۴، جون : باغی فوج کا مٹکاف کے گھر پر حملہ اور ان کے سوار کیمپ کے بائیں جانب پہنچ کر انگریزی کیمپ پر حملہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ بادشاہ کے وزیر محبوب علی خان کا انتقال۔
- ۱۵، جون : باغی فوج کا انگریزی کیمپ کے بائیں جانب صبح کے سات بجے زبردست حملہ۔ بعد میں ایک اور حملے کی تیاری۔ انگریزی فوج کے ایک کمانڈر بریگیڈیر ولسن (Wilson) نے انگریزی فوج کو انتظار کا مشورہ دیا جبکہ گریٹ ہیڈ (Greathed) نے قلعہ پر فوری حملہ کا مشورہ دیا۔
- ۱۶، جون : انگریزی فوج نے فوری حملہ کرنے کی بجائے مزید کمک کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔

- ۱۷، جون : انگریزی فوج کا کشن گنج پر حملہ اور وہاں پر قائم شدہ باغیوں کا مورچہ تباہ ہونے کے ساتھ پورا علاقہ جلا دیا گیا۔
- ۱۸، جون : باغی فوج کا ہندو راؤ کے گھر پر زبردست حملہ۔ لیفٹیننٹ وھیٹلے (Wheatley) اور کئی دوسرے انگریز افسران ہلاک۔
- ۱۹، جون : نصیر آباد کی فوج کا انگریزی کیمپ پر زبردست حملہ۔ انگریزی فوج کے دس افسر اور سو سے زیادہ سپاہی ہلاک۔ نصیر آباد کی فوج بھی کافی نقصان اُٹھا کر واپس آئی۔
- ۲۰، جون : نصیر آباد کی فوج کا انگریزی فوج پر ایک اور زبردست حملہ۔ انگریزی فوج کو علی پور سے تقریباً تین سو اونٹ سواروں کی کمک پہنچی۔
- ۲۲، جون : باغپت کا پل تباہ کردیا گیا۔
- ۲۳، جون : ہندوستانی فوج کا ایک اور زبردست حملہ۔ پندرہ سو سے زائد باغی ہلاک اور زخمی۔ انگریزی فوج کا بے حد نقصان۔ حوصلے پست۔ مزید کمک کی آمد۔
- ۲۷، جون : ہندوستانی فوج کا انگریزوں پر ایک اور زبردست حملہ۔ چار سو سے زائد سپاہی ہلاک اور زخمی۔ انگریزی فوج کے صرف تیس افراد ہلاک ہوئے۔ انگریزی فوج کے پاس مزید دو سو سے زائد اونٹ سواروں پر مشتمل کمک پہنچی۔
- ۲۸، جون : کرنل گریٹ ہیڈ (Greathed)، کنگز رجمنٹ اور سکھ رجمنٹ کو لے کر انگریزی فوج سے ملے۔ بھگت پور پل (باغپت پور) کا بڑا حصہ تباہ کردیا گیا۔
- ۲۹، جون : انگریزی فوج نے بند باندھ کر نہر کے پانی کو روک دیا۔
- ۳۰، جون : باغی فوج کا ایک اور بھرپور حملہ۔ انگریزی فوج کے تیس یا چالیس افراد ہلاک ہوئے۔ دریائے جمنا کا پل ٹوٹ کر بہہ گیا۔
- یکم جولائی : دہلی میں بریلی بریگیڈ کی آمد۔ انگریزی کیمپ میں ۶۱ ویں رجمنٹ کی آمد۔
- ۲، جولائی : انگریزی کیمپ میں آٹھ سو سے زائد افراد پر مشتمل کوکس کارپس (Cox Corps) کی آمد۔
- ۳، جولائی : بریلی بریگیڈ کا علی پور پر کامیاب حملہ۔ انگریزوں کا حوصلہ شکن نقصان
- ۴، جولائی : باغی فوج کا علی پور سے آنے والی فوج کے ساتھ مل کر ایک اور حملہ۔ صبح سات بجے باغی فوج ناکام ہوکر واپس چلی گئی۔

- ۵، جولائی : جنرل برنارڈ (Bernard) کی ہیضے سے موت۔ جنرل ریڈ (Reed) کمانڈر انچیف ہوئے۔ کرنل بیرڈ اسمتھ (Baird Smith) کی شہر پر فوجی حملہ کی تجویز۔
- ۸، جولائی : نجف گڑھ کی نہر پر ہندوستانی سپاہیوں کا بنایا ہوا پل تباہ کردیا گیا۔
- ۹، جولائی : ہندوستانی فوج کا ایک اور زبردست حملہ۔ انگریزی فوج کے دو سو سے زیادہ افراد ہلاک اور سو کے قریب زخمی۔ ہندوستانی سپاہیوں کے پچاس افراد ہلاک اور سو زخمی۔ انگریزی کیمپ میں آرٹلری رجمنٹ کے تقریباً تین سو سپاہیوں کی آمد۔
بادشاہ کی طرف سے گائے ذبح کرنے پر پابندی کا علان۔
انگریزی فوج کی آرٹلری کے ہندوستانی سپاہیوں پر باغیوں سے ساز باز کا شبہ۔ ان سے ہتھیار رکھوا کر انھیں علی پور کی طرف بھیج دیا گیا۔
- ۱۳، جولائی : انگریزی فوج کو گولہ بارود اور اشیائے خورد ونوش کی کمک۔
- ۱۴، جولائی : باغی فوج کا ایک اور زبردست حملہ لیکن بھاری نقصان کے بعد حملہ کرنے والوں کو پسپا ہونا پڑا۔ چیمبرلین اور کئی دوسرے افسر زخمی ہوگئے۔
- ۱۶، جولائی : جنرل ریڈ (Reed) بیمار۔ بریگیڈیر ولسن نے کمان سنبھالی۔ کانپور کے محاذ پر سرہیو ویلر (Sir Hugh Wheeler) کی فوج کی تباہی کی خبر۔
- ۱۷، جولائی : انفنٹری اور سوار رجمنٹ کے آٹھ سو افراد پر مشتمل جھانسی کی فوج دو توپوں سمیت دہلی پہنچی۔
جنرل ریڈ، کرنل کونگریو (Congrev) اور ایک سو پچاس دیگر بیمار اور زخمی انگریزی کیمپ سے انبالہ روانہ ہوئے۔
- ۱۸ جولائی : سکھ کیولری کی ایک بڑی تعداد گولہ بارود اور سامان رسد لے کر انگریزی کیمپ پہنچی۔ انگریزی کیمپ میں ابھی ایک ہزار سے زیادہ زخمی اور بیمار موجود تھے۔
- ۲۰، جولائی : ہندوستانی فوج کا ایک اور زبردست حملہ۔ چھ سات سو فوجی ہلاک یا زخمی۔
- ۲۲، جولائی : سخت گرمی اور بارش۔ باغی ساری رات وقفہ وقفہ سے حملے کرتے رہے۔ لیفٹیننٹ جونز ہلاک۔
- ۲۳، جولائی : ہندوستانی فوج کا ایک اور حملہ۔ کرنل سیٹن (Seton) زخمی ہوگیا۔
- ۲۴، جولائی : ہوڈسن (Hodson) نے کائیڈز کی کمان چھوڑ کر کیولری کی کمان

سنبھال لی۔

- ۲۶، جولائی: ہیولاک (Havelock) کو فتحپور میں نانا صاحب کی فوج پر فتح حاصل ہوئی۔ ۱۲ توپیں اور سات لاکھ کا خزانہ انگریزی فوج کے ہاتھ لگا۔
- ۲۷، جولائی: نیمچہ فوج کی دہلی میں آمد۔
- ۲۸، جولائی کو ایک مخبر نے انگریزوں کو خبر دی کہ

"پل کی تعمیر کی تیاریاں مکمل تھیں مگر اب اس کام پر مقرر فوج کو واپس بلا لیا گیا ہے۔ ٹونک کے سراج الدین نے آج اپنی فوج کی حاضری لی۔ اس فوج میں سات ہزار آدمی تھے۔

ایک اطلاع کے مطابق (باغیوں کی مدد کے لیے) بمبئی سے آنے والی فوج اور جودھ پور کے راجہ کی فوج کے درمیان جنگ ہوئی ہے مگر ابھی اس خبر کی تصدیق نہیں ہوئی۔ سرسہ سے ایک شخص نے آکر اطلاع دی ہے کہ رانیہ کے نواب کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ ہانسی سے خبر آئی ہے کہ انگریزی فوج کے آٹھ ہزار افراد پر مشتمل ایک دستہ نے ہانسی کے قلعہ پر قبضہ کرلیا ہے۔ لیکن یہ اطلاع صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ حکیم عبدالحق کو گوڑ گاؤں کا ناظم مقرر کیا گیا ہے۔ دوسرے چھ تحصیلداروں اور تھانہ داروں کا تقرر بھی ہوا ہے مگر ان میں سے کسی نے اب تک اس پر عمل نہیں کیا ہے۔

جنگ کے منصوبے کی تکمیل کی ذمہ داری اب، ملکہ زینت محل کی سفارش پر، جنرل بخت خاں کو تفویض کردی گئی ہے اور اس کے ساتھ انگریزوں کی دائیں طرف کی بیڑیوں کو سر کرنے کے بعد فوج کا کمانڈر انچیف اور ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح مرزا جواں بخت کو ولیعہد مقرر کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اگر آپ رضا مند ہوں تو میں اپنے بھائی کو معمولی تنخواہ کے عوض جنرل بخت خاں کے دفتر میں ملازم کرانے کا بندوبست کردوں۔ اس طرح ہمیں ان کے منصوبوں کی صحیح اطلاع ملتی رہیں گی۔ لیکن اس کے لیے مجھے آپ کی تحریری رضامندی درکار

ہوگی۔ فتح گڑھ سے کوئی فوج ابھی تک یہاں نہیں پہنچی۔
فرخ آباد سے خط آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں جنگ جاری ہے۔ غالباً کل، باغی فوج سوائے ایک رجمنٹ کے جو شاہی قلعے کی حفاظت کے لیے متعین ہے، پوری قوت کے ساتھ کیمپ پر حملہ کرے گی۔ آج جنگ کی مشاورتی کونسل کا اجلاس ہو رہا ہے۔ اس کی تفصیل آج شام تک مجھے مل جائیں گی۔ اگر آپ آج رات اپنا کوئی آدمی بھیج دیں تو کل صبح تک یہ معلومات آپ تک پہنچ سکتی ہیں۔''

- ۲۹، جولائی : مولوی رجب علی نے جنرل ہوڈسن کو اطلاع دی کہ اس نے بادشاہ کو شہر کا دروازہ کھول کر انگریز فوج کو شہر میں داخل ہونے دینے کا مشورہ دیا تھا لیکن احسن اللہ خان نے اس کی مخالفت کی۔ مولوی رجب علی کی رپورٹ کا متن یہ ہے:

''آج شہر کے ہندوؤں نے پانچ قصابوں کو گائے ذبح کرنے پر ہلاک کردیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نااتفاقی بڑھتی جارہی ہے۔ بادشاہ سلامت نے اس کی روک تھام کے لیے شہر میں گائے بلکہ بکرے کے گوشت کی فروخت کی بھی ممانعت کردی ہے۔ کٹر قسم کے بعض مسلمان اس پر کافی خفا ہیں۔ انھوں نے عید کے دن سرِ عام گائے ذبح کرنے کا اعلان کر رکھا ہے۔ اگر ہندو سپاہیوں نے انھیں روکنے کی کوشش کی تو ان کا ارادہ ان کے خلاف جہاد کرنے کا ہے۔ جس میں وہ یا تو ہندوؤں پر فتح حاصل کریں گے یا شہید ہوجائیں گے۔ اس کے لیے گائے کے ذبیحہ کے مخالف کے خلاف جنگ کرنا اتنے ہی ثواب کا کام ہے جتنا فرنگیوں کے خلاف۔ یہ کہتے ہیں ہمیں چاہیے کہ پہلے ہندوؤں سے نپٹ لیں بعد میں انگریزوں سے بھی نپٹ لیں گے۔ یقینی بات ہے کہ عید کے دن یہاں خون خرابہ ہوگا۔
حکیم احسن اللہ خان سپاہیوں کی تنخواہ میں خرد برد کررہا ہے۔ ان کی تنخواہ میں چار روپے فی کس ان کو ادا کرتا ہے اور بقیہ چھ روپے خود کھاتا ہے۔ سپاہی بے حد ناراض ہیں خیال ہے اس کو

جلد مار ڈالیں گے۔

.....۴۷ ویں اور ۵۴ ویں رجمنٹوں کے پاس پانچ سو من بارود کا ایک علیحدہ ذخیرہ موجود ہے جو وہ کسی دوسری رجمنٹ کو دینا نہیں چاہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ بارود کا یہ ذخیرہ انھوں نے اپنے استعمال اور حفاظت کے لیے جمع کیا تھا اس پر کسی دوسری رجمنٹ کا حق نہیں۔ یہاں پر تقریباً چار سو من کچا گندھک موجود ہے۔ لیکن صاف کیے ہوئے گندھک کا کوئی ذخیرہ شہر میں موجود نہیں۔ دہلی کے شرفاء کافی خوف زدہ ہیں۔ انھیں اس جنگ میں سلامتی کی توقع نہیں۔ مفتی صدر الدین آزردہ اور نواب حامد علی خاں کے گھروں پر کافی دنوں سے پہرہ ہے۔

میں نے بادشاہ سلامت کو مشورہ دیا تھا کہ ان کو چاہیے کہ خفیہ طور پر شہر کا دروازہ کھلوا کر انگریزی فوج کو شہر میں داخل ہونے کا بندوبست کریں۔ اس طرح ان کی جان تو شاید نہ بچ سکے لیکن اس احسان کے بدلے انگریز ان کے ورثاء سے اچھا سلوک کریں گے۔ بادشاہ سلامت تو راضی ہوجاتے لیکن حکیم احسن اللہ خان نے دخل اندازی کر کے معاملہ خراب کردیا۔''

- ۳۰، جولائی: انگریزی فوج کماؤں سے آنے والی مدد کا انتظار کرتی رہی۔
- ۳۱، جولائی: ہندوستانی فوج کا انگریزی کیمپ پر متحدہ حملہ۔ شدید بارش کی وجہ سے حملہ ناکام اور سخت جانی نقصان۔ اس نقصان کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کے ایک مخبر نے انھیں حملے کی تفصیل مہیا کردی تھی۔ مخبر کی رپورٹ کا متن یہ ہے:

''کل بارش کی وجہ سے حملہ ملتوی کرنا پڑا۔ پلوں کی مرمت کی تیاری مکمل ہے۔ مندرجہ ذیل فوجیں آج علی پور جانے کے لیے تیار کھڑی ہیں:

پیادہ فوج کی ۲۱ رجمنٹیں اور بریلی رسالہ کے ۲۰۰۰ ہزار سپاہی

نیمچ فوج کے پاس جو اسلحہ موجود ہے اس کی تفصیلات یہ ہیں:

توپ کے گولے: ۵۰۰۰۰

گولوں کے خول: ۲۰۰۰۰

گولے : ۱۵۰
گول گولے : ۲۵۵
انگور نما گولے : ۱۵۰
بارود کے کنستر : ۱۲۵
گولوں کو داغنے کے چارجرز : ۶۰۰

اس کے علاوہ ان کے پاس گھوڑوں سے کھنچی جانے والی بارہ توپیں، پیادہ فوج کی پانچ رجمنٹیں اور کیولری کی ایک رجمنٹ بھی ہے۔ انھوں نے باغپت کے لیے چار اور توپیں بھیجنے کا حکم بھی دیا ہے۔ ان کے پاس اس وقت گھوڑوں سے کھنچی جانے والی ۳۱ توپیں ہیں۔ محاصرہ توڑنے والی توپوں (Seige Guns) کی تعداد انگریزوں سے بھی زیادہ ہے۔ بارود اور کارتوس کے چارجرز بنانے کے لیے ۲۵۰ مستری کام کررہے ہیں۔ ان کے پاس ۴۰۰ من دیسی بارود کا ذخیرہ ہے۔ جو بھی انگریزی بارود ان کے پاس بچا تھا وہ اب سلیم گڑھ میں مقیم ۴۷ ویں رجمنٹ کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ کل جتنے بھی کارتوس بنے تھے وہ آج فوج میں تقسیم کردیئے گئے ہیں۔

کارتوسوں کی پیٹیاں بنانے کے لیے کہا جارہا ہے کہ بارود کے کارخانے کے ایک ملازم کلو مستری نے اعلیٰ نمونے کی پیٹیاں تیار کی ہیں۔ اس طرح شہر کے ایک داروغہ مظہر علی نے گولوں کو داغنے کا مسالہ تیار کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ ان بدمعاشوں کو رشوت دے کر اپنے ساتھ ملایا جاسکتا ہے لیکن آپ کی اجازت کے بغیر میں یہ قدم نہیں اُٹھاؤں گا۔

نیمچہ فوج کے جنرل غوث خان اور سپہ سالار جنرل بخت خان ایک دوسرے کے سخت مخالف ہیں۔ کل حملہ ملتوی ہونے کی سب سے بڑی وجہ ان کا اختلاف تھا۔ بادشاہ سلامت بخت خان کی حمایت کرتے ہیں اور اب ان دونوں میں صلح کرانے میں مصروف ہیں۔

رحیم اللہ سوداگر کانپور سے آیا ہے۔ اس نے اطلاع دی ہے
کہ نانا صاحب نے فتح پور کے قریب انگریزی فوج کا مقابلہ کیا
اور شکست کھانے کے بعد وہاں سے کسی طرف بھاگ گیا ہے۔ یہ
بھی اطلاع ملی ہے کہ انگریزوں کی پانچ رجمنٹ اور سکھوں کی
ایک رجمنٹ کانپور پہنچ گئی ہے۔ یہاں کی فوج کا ایک حصہ مدد
کے لیے لکھنؤ روانہ ہونے والا ہے۔

کلکتہ اور کانپور کے درمیانی علاقے میں امن و امان کی خبر ملی
ہے۔ ایک دوسری اطلاع کے مطابق بمبئی کی فوج ابھی تک اپنے
قلعے میں ہے اور انگریزوں کی وفادار ہے۔ پنجاب سے جو فوج
روانہ ہوئی تھی وہ مہاراجہ پٹیالہ کی فوجوں کا مقابلہ کرنے میں
مصروف ہے۔ باغپت جانے والی فوج پہلے مالا گڑھ جائے گی
جہاں میرٹھ سے آنے والی انگریزی فوج کے حملے کا اندیشہ ہے''

- یکم اگست، عید قرباں: شام چھ بجے سے رات بارہ بجے تک باغی فوجوں کے ہندو راؤ کے گھر پر زبردست اور متواتر حملے۔ ہزار سے زیادہ ہلاک و زخمی۔ انگریزی فوج کے تیس افراد ہلاک و زخمی ہوئے۔
- ۲، اگست: ہندو راؤ کے گھر پر مسلسل حملے۔ باغی فوج کے دو سے تین ہزار افراد ہلاک و زخمی، صرف نیمچہ اور نصیر آباد بریگیڈ کا نقصان نو سو سے زائد کا تھا۔ مولوی رجب علی نے اپنی رپورٹ میں ہندوستانیوں کے حملے کی پوری کیفیت بیان کی ہے:

'' کل شام کی جنگ انگریزی مورچوں پر بندوق کے حملے
سے شروع ہوئی۔ بیچ میں کچھ دیر کے لیے وقفہ بھی رہا۔ انگریزی
فوج اپنے مورچوں پر جمی رہی اور جب باغی فوج قریب پہنچ گئی تو
انھوں نے اس پر توپوں اور بندوقوں سے گولہ باری شروع کردی۔
یہ سلسلہ رات نو بجے تک جاری رہا۔

ندی پر باغیوں نے جو پل بنایا تھا وہ بارش میں بہہ گیا اور
آس پاس کے زمیندار پل کے تختے اور لکڑیاں اُٹھا کر لے گئے۔

باغیوں کا فوج دستہ محاذ سے اب واپس پہنچا ہے۔ یہ وہ دستہ
ہے جس نے شام کو آٹھ بجے کے قریب دوسرے سپاہیوں کے

ساتھ مل کے ہمارے مورچوں پر حملہ کیا تھا۔ جن مورچوں پر حملہ کیا گیا ان میں سبزی منڈی، ہندو راؤ اور ماؤلہ مورچہ شامل ہیں۔

انگریز فوج کو اپنے مورچے چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کو صرف حملہ آوروں کا جواب دینے اور جب وہ قریب پہنچ جائیں تو ان پر گولہ باری کرنے کی ہدایت تھی۔

باغی جب پسپا ہونے لگے تو ان پر گولوں کی بوچھار کردی گئی۔ انھوں نے دوبارہ حملہ کیا اور دوبارہ ان کا یہی حشر ہوا۔ باغی رات بھر اسی طرح حملے کرتے رہے اور ہر بار انھیں اسی طرح پسپا ہونا پڑا۔

اب صبح کے دس بجے ہیں۔ انھوں نے ہندو راؤ کے گھر اور باولی کے مورچوں کو چھوڑ کر سبزی منڈی کے مورچوں پر توجہ دینی شروع کی ہے۔ کیپٹن ٹریورز کو گولہ لگا اور وہ ہلاک ہوگیا۔

ہماری فوج کے تقریباً پندرہ افراد ہلاک اور زخمی ہوئے ہیں جبکہ دشمن کا نقصان اس سے بہت زیادہ ہوا۔ ان کی صحیح تعداد کی اطلاع بعد میں دی جائے گی۔

باغیوں نے اپنے حملے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ فوج کا ایک دستہ چار گھنٹے تک محاذ پر جا کر لڑتا ہے اور بگل کی آواز پر واپس دہلی آجاتا ہے۔ اور اس کی جگہ ایک دوسرا دستہ لے لیتا ہے۔ اس طرح لڑائی متواتر جاری رہتی ہے اور باغیوں کی تمام فوج جنگ میں باری باری حصہ لیتی رہتی ہے''

- ۳، اگست : ہیولاک (Havelock) کی نانا صاحب کو شکست دے کر لکھنؤ کی طرف بڑھنے کی خبر

باغی نجف گڑھ کی جھیل پر پل بنانے میں کامیاب ہوگئے مگر بارش اور سیلاب میں پل پر جانے سے ہندوستانی فوج کی توپیں ضائع ہوگئیں۔

- ۴، اگست : دل برداشتہ ہوکر کچھ ہندوستانی سپاہیوں کے شہر سے روانہ ہونے کی اطلاع۔
- ۵، اگست : ہندوستانی سپاہیوں کا بنایا ہوا کشتیوں کا پل تباہ کرنے کی انگریزی فوج

کی کاشش ناکام۔

- ٦، اگست: ہندوستانی فوج کا شہر سے باہر آکر انگریزی کیمپ پر حملہ۔
- ٧، اگست: کرنل بیرڈ اسمتھ (Baird Smith) اور جنرل اسمتھ کا آپس میں جھگڑا۔ انگریزی کیمپ پر ہندوستانی فوج کے رات بھر متواتر حملے ہوتے رہے۔ مگر ان بہادرانہ حملوں کا خاطر خواہ اثر اس لیے نہیں ہوسکا کہ غدار گھر کے چراغ سے گھر کو آگ لگا رہے تھے۔ اس کا کچھ اندازہ گوری شنکر کے اس خط کے متن سے ہوتا ہے:

"انگریزی کیمپ پر حملہ کرنے کے لیے جو فوج جاتی ہے اس میں فوج کے چار ڈویژن حصہ لیتے ہیں۔ پانچواں ڈویژن نگمبود پر متعین ہے۔ ان میں سے ایک ڈویژن قدسیہ باغ میں، دوسرا بوٹا بیڑی پر، تیسرا ابی کے پل پر اور چوتھا تیسرے ڈویژن کی مدد کے لیے متعین ہے۔ انگریزی فوج پر حملہ کرنے کے لیے آج جس فوج کو کہا گیا تھا اس کے کافی سپاہی ابھی تک تیلی واڑہ میں ستا رہے ہیں۔ بارہ بج چکے ہیں اور محاذ پر جانے والی فوج کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں۔ کل رات تک ان کا منصوبہ علی پور فوج بھیجنے کا تھا۔ آج صبح انھوں نے کیا فیصلہ کیا ہے اس کا ابھی تک علم نہیں ہوسکا۔ فوج کی دو رجمنٹوں اور سواروں کے ایک رسالے کو ہانسی جانے کا حکم ملا ہے لیکن یہ فوج ابھی تک دہلی میں ہے۔ ہریانہ کے سپاہیوں کو اطلاع ملی تھی کہ بیکانیر کے راجہ نے انگریزوں کی مدد سے ان کے گھروں کو لوٹ لیا۔ انھوں نے انتقام لینے کے لیے بادشاہ سے مدد مانگی بادشاہ نے ہانسی جانے والی فوج کو دو توپوں سمیت ان کی مدد کو جانے کو کہا تھا مگر یہ فوج ابھی تک اپنی تنخواہوں کا انتظار کر رہی ہے۔ تنخواہ ملتے ہی یہ فوج روانہ ہوجائے گی۔ باغی فوج کافی شکستہ دل ہے۔ جنرل بخت خاں اور جنرل سدھارا سنگھ کھلم کھلا ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں۔ فوج میں افواہ ہے کہ جنرل بخت خاں انگریزوں سے ساز باز کر رہا ہے۔ حکیم احسن اللہ خان کی پوزیشن بھی مشکوک ہے لیکن وہ بادشاہ کی حفاظت میں ہے۔

جھجر کے نواب سے رقم حاصل کرنے کے لیے اس کے سر پر سو سوار سوار ہیں۔ اس کو ایک کافی سخت قسم کا خط بھی لکھا گیا ہے۔ شہر میں ٹیکس وصول کرنے کے لیے میونسپل کونسل مقرر کی گئی ہے۔ نواب احمد مرزا خان اور راجہ جے سنگھ کا لڑکا اس کونسل کے ممبر ہیں۔ ان کے خاندانوں کا سرکار کو خوب علم ہے۔ شاہ زادہ مرزا مغل ان کے زیر اثر ہے۔ وہ خود اس کونسل کی انتظامیہ کا سربراہ ہے۔ کل دہلی کے پنجابی سوداگران نے پچاس ہزار روپے کا عطیہ دیا تھا۔ دوسرے عطیات ابھی وصول کیے جا رہے ہیں۔ بہادر گڑھ کے نواب بہادر علی خان کو علی پور جانے والی فوج کے لیے خوراک و رسد کا انتظام کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ ضلع پلوال کے سعد الدین نے آج مرزا مغل سے ملاقات کی اور اسے دو سو روپے کا نذرانہ پیش کیا۔ وہ آج جنگ کے لیے محاذ پر گیا ہے۔ چھٹی سے واپس آنے والے سواروں نے اپنی تنخواہ کا مطالبہ کیا تھا جب تنخواہ نہ ملی تو ان میں سے دو سو سوار اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

بادشاہ نے بھرے دربار میں اعلان کیا ہے کہ انگریزوں کا نام و نشان عنقریب ہندوستان کے نقشے سے مٹا دیا جائے گا۔ وہ لوگ جو اس بھروسے پر بیٹھے ہوئے ہیں کہ انگریز واپس آئیں گے غلطی پر ہیں۔ بنگال، مدراس اور بمبئی کے تمام علاقوں نے کھلم کھلا بغاوت کر دی ہے۔ انگلستان کے انگریزوں نے اگر اپنے ہم وطنوں کی مدد کے لیے انگلستان چھوڑ کر آنے کا ارادہ کیا تو وہ خود اپنا ملک بھی کھو دیں گے۔ اس ملک میں انگریزوں کا کوئی دوست باقی نہیں جبکہ بادشاہ کی مدد کے لیے ہر حصے سے پیغامات آ رہے ہیں۔

باغیوں نے کل حکیم احسن اللہ کا مکان لوٹ لیا اور اسے آگ لگا دی۔ حکیم خود قلعے میں قید ہے۔ باغیوں نے بادشاہ سے کہا ہے کہ حکیم احسن اللہ کو ان کے حوالے کیا جائے ورنہ خود اس کی اور اس کے خاندان کی جانیں بھی خطرے میں پڑ جائیں گی۔ آخر مجبور ہو کر بادشاہ نے حکیم احسن اللہ کو اس شرط پر ان کے حوالے کیا کہ

اس کو کسی قسم کی زک پہنچائی تو وہ خود بھی خودکشی کرلے گا۔ اس مقصد کے لیے اس کے پاس ہمیشہ ایک ہیرا رہتا ہے۔ ملکہ زینت محل پر بھی باغی شک کر رہے ہیں۔ شہر کے مسلمانوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ بادشاہ کی شہادت کے بعد خود بھی زندہ رہنا گوارا نہیں کریں گے۔ آج دربار میں کسی امیر نے حاضری نہیں دی۔ شہر کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں ہیں۔ دکانیں بند ہیں۔ ملکہ زینت محل کے محل پر پہرہ ہے ورنہ وہ بھی لوٹ لیا جاتا۔

بارود کی فیکٹری میں جو دھماکہ ہوا تھا اس میں تقریباً پانچ سو افراد ہلاک ہوئے۔ ہلاک شدگان کاریگروں کی لاشوں کو ان کے رشتہ دار ساری رات ملبہ سے نکالتے رہے۔ یہ کام ابھی تک جاری ہے۔ اس دھماکے میں تقریباً ایک سو افراد زخمی بھی ہوئے۔ یہ دھماکہ کسی حادثہ کی وجہ سے ہوا تھا۔ حکیم احسن اللہ کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کل ساری رات جنگ جاری رہی۔ کسی کو شہر چھوڑ کر جانے کی اجازت نہیں۔ قلعے کے دروازے بند ہیں۔

بعد کی اطلاعات: دھماکے کے وقت کارخانے میں ۲۰ من بارود جمع تھا۔ اس کارخانے میں جتنا بارود تیار ہوتا تھا اسے قلعے اور باغیوں کی مختلف فوجوں میں تقسیم کردیا جاتا تھا۔"

- ۱۲، اگست: انگریزوں کا دیسی مورچوں پر حملہ اور ان کی چار توپوں پر قبضہ۔ انگریزی فوج کے سو سے زائد افراد ہلاک و زخمی۔ ہندوستانی فوج کا کہیں زیادہ نقصان۔
- ۱۳، اگست: سارا دن توپوں کی گولہ باری۔ بیرڈ (Baird) اسمتھ زخمی۔
- ۱۴، اگست: نکلسن (Nicholson) ڈھائی ہزار فوج، بھاری توپیں اور اسلحہ بارود کا ذخیرہ لے کر انگریزی فوج کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔
- ۱۶، اگست: انگریزی فوج کو محاصرہ توڑنے والی توپوں اور مزید کمک کا انتظار۔ انگریزی کیمپ میں موجود بارود کے ذخیرہ کو تباہ کرنے کی کوشش لیکن اس کی اطلاع بھی انگریزوں کو ہوگئی۔ ان کے مخبر نے لکھا کہ:

"میں میگزین کا معائنہ کرنے گیا تھا اور وہاں پتہ چلا کہ کارتوسوں کی ۱۷۵،۰۰۰ ٹوپیوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ ان کے لیے

بارود موجود نہ تھا۔ اب کافی گفت و شنید کے بعد قلعے میں متعین دہلی رجمنٹ سے ۱۵۰ من انگریزی بارود حاصل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ۳۰۰ من دوسرا بارود بنانے کے لیے بھی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ اسلحہ خانے میں انگریزی بارود کے ۲۷ ڈھول موجود تھے۔ یہ بھی اب کارتوس بنانے کے لیے استعمال کیے جارہے ہیں۔

آٹھویں اریگولر رجمنٹ کے رسالدار محمد شفیع کی اطلاع کے مطابق پچھلے چار دنوں میں باغی فوج کے تین ہزار سپاہی فرار ہوچکے ہیں۔ سپاہی تنخواہ نہ ملنے پر شور مچاتے رہتے ہیں۔ بادشاہ کے پاس ان کی تنخواہوں کی ادائیگی کے لیے کوئی خزانہ باقی نہیں ہے۔ نہ ان کو تنخواہ ملے گی اور نہ یہ لوگ لڑنے کو تیار ہوں گے۔

پچھلے تین دنوں سے یہاں افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ بارود کے کارخانے میں جو دھماکہ ہوا تھا اس میں کارخانے کے قریب رہنے والے شاہی محل کے ہاتھیوں کے داروغہ میر نواب عزیز میر حیدر علی کا ہاتھ ہے۔ اس پر انگریزوں سے ساز باز کرنے اور ان کو خفیہ خبریں پہنچانے کا الزام لگایا جارہا ہے۔ مجھے یقین ہے اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو حکیم احسن اللہ کا ہوا ہے۔ اس کے گھر کو لوٹ کر اسے جیل میں ڈال دیا جائے گا۔

محاذ پر زخمی ہونے والے باغی کم ہی شہر میں واپس آتے ہیں۔ اکثر شہر کے باہر پڑے رہتے ہیں تاکہ شہر کے لوگوں کو ان کی بزدلی کا علم نہ ہونے پائے۔ یہ لوگ اس امید پر بیٹھے ہوئے ہیں کہ پنجاب کی رجمنٹیں بغاوت کرکے ان کی مدد کو آنے والی ہیں۔ باغی فوج کے افسر کہتے رہتے ہیں کہ بمبئی سے انفنٹری کی ۲۲ بٹالین، کیولری کی دس رجمنٹ اور ہارس آرٹلری کی دس توپیں دہلی پہنچنے والی ہیں۔ یہ فوج جے پور میں لوٹ مار کرکے الور پہنچ گئی ہے اور ایک ہفتے کے اندر دہلی پہنچ جائے گی۔ جنگ کی مشاورتی کونسل نے میرٹھ کے گوجروں کی مدد کے لیے بریلی بریگیڈ کو وہاں

بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فوج میں آرٹلری اور کیولری کی کچھ رجمنٹیں شامل ہیں اور یہ فوج کل میرٹھ کے لیے روانہ ہوجائے گی۔ اس فوج کی صحیح تعداد کا ابھی تعین نہیں کیا گیا۔ میرٹھ کے گوجروں نے اس فوج کے تمام اخراجات کا ذمہ لیا ہے۔

۱۳، اگست کو فیصلہ کیا گیا تھا کہ نیچہ بریگیڈ مسوری سے ہوتا ہوا باغپت جانے والی فوج سے آملے اور یہ دونوں فوجیں مل کر علی پور حملہ کریں۔ انگریزی فوج کے نو سکھ بھاگ کر باغیوں سے آملے ہیں ۱۴ تاریخ کو لکھنؤ سے ایک سو سوار بھاگ کر یہاں آئے تھے۔ ان میں سے بارہ زخمی ہیں۔ سکھوں نے بادشاہ سے درخواست کی تھی کہ پٹھانوں اور سکھوں کو مختلف رجمنٹوں سے نکال کر ان کی ایک علیٰحدہ رجمنٹ بنا دی جائے۔ ان کی اس درخواست پر عمل کرتے ہوئے کل ان کی ایک علیٰحدہ رجمنٹ بنا دی گئی۔ کل رات یہ رجمنٹ محاذ پر لڑتی رہی۔ اس رجمنٹ کے سپاہی رات کے وقت مختلف جگہوں پر چھپ جاتے ہیں اور موقع ملتے ہی کیمپ پر حملہ کرتے ہیں۔ دہلی اور میرٹھ کی رجمنٹوں کی بھی ایک علیٰحدہ کمانڈ بنا دی گئی ہے۔ کل ایک سو سوار جن کے رشتہ دار بمبئی سے آنے والی فوج میں شامل ہیں، ریواڑی کی طرف روانہ ہوئے تا کہ یہ معلوم کرسکیں کہ آیا بمبئی کی فوج دہلی کی طرف روانہ ہوچکی ہے کہ نہیں ..... کل بارہ ماشکی جو ہانسی جانے والی فوج کے ساتھ گئے تھے واپس آگئے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے ساتھ جانے والی فوج کے بے شمار سوار جونہی اپنے گاؤں کے پاس پہنچتے ہیں، فوج سے فرار ہوکر اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ اس طرح سمپلہ پہنچتے پہنچتے اس فوج کے چار سو سوار بھاگ چکے تھے۔

آپ کو چاہیے کہ کرنل سانڈرز Col. Sanders کو مسوری اور باغپت کے ذریعے باغیوں کے علی پور پر حملہ کرنے کے منصوبہ کی اطلاع دیں تا کہ وہ اس کا انتظام کرسکیں۔

آج سو سواروں نے دریا عبور کرکے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔

سپرز اور مینرز کو ان کے ہتھیار دے دینے کے لیے کہا گیا تھا۔ انھوں نے انکار کر دیا جس کی وجہ سے فوج کے دوسرے سپاہیوں نے انھیں گرفتار کر لیا۔

پچھلے دنوں تقریباً دو سو سکھ دہلی میں آئے۔ یہ لوگ سبزی منڈی میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ نیمچ اور بریلی بریگیڈ کل نجف گڑھ اور باغپت روانہ ہونے والے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد دہلی کے دفاع کے لیے صرف میرٹھ اور دہلی رجمنٹ اور کچھ سپاہی اور سوار یہاں رہ جائیں گے۔ آپ کو چاہیے کہ کسی عقلمند اور ہوشیار آدمی کو یہاں بھیج کر فوج کی صحیح تعداد معلوم کریں اور شہر پر حملہ کا فیصلہ کریں۔ باغپت جانے والی فوج میں انفنٹری کی چھ بٹالین، کیولری کی دو رجمنٹ اور بارہ ہلکی توپیں اور نجف گڑھ جانے والی فوج میں انفنٹری کے چھ بٹالین، کیولری کی دو رجمنٹ اور اٹھارہ ہلکی توپیں شامل ہوں گی۔''

- ۱۷، اگست : انگریزی کیمپ میں دو ہندوستانی سپاہیوں کو بارود کا ذخیرہ خراب کرنے کے جرم میں پھانسی۔
- ۲۰، اگست : نکلسن اور ہوڈسن کی فوجوں کی قلعے پر مہم ناکام۔
- ۲۱، اگست : باغی فوجوں کی منکاف کے گھر اور کوکس کے کمپاؤنڈ پر گولہ باری۔
- ۲۲، اگست : انگریزی کیمپ پر باغی فوج کی زبردست گولہ باری۔
- ۲۳، اگست : قلعے کی طرف انگریزی توپوں کی پیش قدمی اور فصیل سے چھ سو گز دور پڑاؤ۔
- ۲۵، اگست : نکلسن (Nicholson) ہندوستانی فوجوں کو آنے والی مدد روکنے کے لیے دو ہزار فوج اور سولہ توپیں لے کر نجف گڑھ روانہ ہوا۔
- ۲۶، اگست : نجف گڑھ کے محاذ پر ہندوستانی فوجوں کی شکست۔ ۱۳ توپیں اور بیشمار اسلحہ و بارود انگریزی فوج کے ہاتھ لگا۔
- ۲۹، اگست : انگریزی کیمپ میں گولہ بارود سے لدے پانچ سو چھکڑوں کی آمد۔ محاذ پر نسبتاً خاموشی۔

- ۳۰/۳۱، اگست : رات کو گولہ باری، دن میں خاموشی۔
- یکم ستمبر : مہاراجہ کشمیر اور میرٹھ کی فوجیں انگریزوں کی مدد کے لیے کیمپ پہنچیں۔

ایک طرف انگریزوں کی قوت میں اضافہ ہوا۔ دوسری طرف غداروں نے انھیں حریت پسندوں کی طاقت و سرگرمی سے آگاہ کیا۔ فتح محمد خان کا ۳ دسمبر کا خط اس کا گواہ ہے :

"فوج کے تمام افسر کل تنخواہ کا مطالبہ کرنے کے لیے شاہی محل گئے تھے۔ کافی گڑبڑ کا اندیشہ تھا۔ بادشاہ سلامت نے بہت مجبور ہوکر ان کو چالیس ہزار روپے دیے اور بقیہ رقم کی ادائیگی کے لیے ۱۵ دن کا وعدہ کیا۔ اب جو رقم ملی ہے اس کو فوج میں اس طرح تقسیم کیا جائے گا۔

رسالدار - ۱۲ روپے

نائب رسالدار - ۸ روپے

جمعدار - ۶ روپے

دفعداد - ۵ روپے

سوار - ۳ روپے

سپاہی - ۲ روپے

کاریگر اور مزدور - ۱ روپیہ

(میں نے تنخواہ کی تقسیم کی یہ فہرست رسالدار محمد شفیع کی رہائش گاہ پر دیکھی تھی)

افواج کی تنخواہ کا بندوبست کرنے کے لیے اب جو انتظامات کیے جارہے ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :

دہلی کے شہریوں سے ایک لاکھ روپیہ چندہ جمع کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے مسلمانوں کی ذمہ داری مفتی صدر الدین کو اور ہندوؤں کی ذمہ داری لالہ مکند لال کو دی گئی ہے۔ ان دونوں نے پندرہ دن کے اندر وہ رقم جمع کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ انھیں پوری امید ہے کہ اس وقت تک انگریز دہلی فتح کرچکے ہوں گے۔

کل میر غلام علی کو باغپت کا تحصیل دار مقرر کیا گیا تھا۔ وہ رسالدار مرزا بیگ کے زیر کمان انفنٹری کی دو کمپنیاں اور اریگولر کے دو سوار ساتھ لے کر باغپت روانہ ہوا ہے۔ مرزا مغل کو دوبارہ سپہ سالار مقرر کردیا گیا ہے۔ شہر کے تمام انتظام اور لگان وغیرہ کی ذمہ داری بادشاہ کے ہاتھ میں ہے۔ گندھک کی قلت کی وجہ سے بارود کا کارخانہ بند پڑا ہے۔ نیمچہ بریگیڈ کو کچھ نئی توپیں دی گئی ہیں۔

نصیر آباد، بریلی اور نیمچہ بریگیڈ کے تمام افسر کل بخت خان کی رہائش گاہ پر جمع ہوئے۔ انھوں نے اپنی اپنی تلواریں درمیان میں رکھ کر قسم کھائی ہے کہ زندگی اور موت میں وہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔

پہاڑی کے انگریز مورچے سے جو گولہ باری کی گئی تھی اس سے شاہی برج کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ نیمچہ بریگیڈ کے جنرل غوث محمد کو اس مورچہ کو فتح کرنے کو کہا گیا ہے۔ وہ عنقریب اس مورچہ پر حملہ کرے گا۔ ساٹھویں انفنٹری کے ایک سپاہی، امیر خان کا بھائی لکھنؤ کے قریب چندر گڑھ نامی گاؤں سے کل یہاں آیا ہے۔ اس نے اطلاع دی ہے کہ انگریزی فوج نے بشیر گنج پہنچ کر مورچہ قائم کرلیا ہے۔ وہاں پر کئی روز سے جنگ ہورہی ہے۔ اریگولر فوج کا رسالدار برکت احمد گولہ لگنے سے ہلاک ہوگیا ہے۔ فوج میں اس کا بے حد افسوس کیا جارہا ہے۔ آج جب نیمچہ فوج کی حاضری لی گئی تو پتہ چلا کہ مختلف رجمنٹوں سے تقریباً چھ سو آدمی غائب ہیں۔ یہ بریگیڈ اب کافی دل برداشتہ ہے۔"

اسی دن گوری شنکر مخبر نے بھی اطلاع پہنچائی:

"کل تنخواہ کی ادائیگی کے لیے شاہی محل میں کافی ہنگامہ ہوا۔ فوج کی دو کمپنیوں نے بادشاہ کی رہائش گاہ کا محاصرہ کرلیا اور فوج کے صوبے دار اپنی فوج کا مطالبہ کرنے لگے۔ بادشاہ سلامت نے فوراً باہر آکر جواب دیا کہ اس نے انھیں نہ تو وہاں آنے کی دعوت

دی تھی اور نہ وہ ان کے یہاں آنے سے خوش ہیں۔ اس کے پاس کوئی رقم باقی نہیں رہی جو وہ ان کو دے سکے اس پر کافی دیر تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر کار رسالدار سلیم شاہ نے بیچ بچاؤ کر کے معاملہ طے کیا اور بادشاہ ان کو چالیس ہزار روپیہ دینے کو تیار ہوگیا۔ صوبہ داروں نے کہا کہ یہ رقم فوج کی تنخواہوں کی ادائیگی کے لیے ناکافی ہے اس پر بادشاہ نے سونے کے ۱۰۱ مہرے جو بریلی کے نواب نے اسے نذرانہ کے طور پر بھیجے تھے ان کو دینے کے لیے تیار ہوگیا لیکن پھر بھی صوبہ داروں کی تسلی نہ ہوئی۔ اس کے بعد بادشاہ نے شاہی بیگمات کے زیور بھی ان کو دینے کا وعدہ کیا اور اپنے تخت کی گدی کو ان کے سامنے پھینک کر کہا کہ یہ بھی لے جاؤ۔ درباریوں پر اس بات کا بہت اثر ہوا اور انھوں نے صوبہ داروں کو سمجھا بجھا کر دربار سے باہر نکال دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ فوج کو تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے یہاں کافی ہنگامے ہوئے ہیں۔ شہر اور محل کے رہنے والوں کو اب صرف خدا ہی بچا سکتا ہے۔

کل مورچوں پر دہلی بریگیڈ پہرہ دے رہا تھا۔ آدھی رات کے وقت جب نیمچ بریگیڈ ان کی جگہ لینے کے لیے وہاں پہنچا تو دہلی بریگیڈ نے یہ کہتے ہوئے کہ بھگوڑوں کو یہ ذمہ داری نہیں دی جاسکتی وہاں سے جانے سے انکار کردیا۔ آخر جب نصیر آباد کے بریگیڈ کو اس جھگڑے کی اطلاع ملی تو اس نے وہاں پہنچ کر معاملہ رفع دفع کیا اور مورچوں پر اپنا پہرہ مقرر کردیا۔

بلب گڑھ کے راجہ نے بادشاہ کو یہ خط بھیجا ہے کہ اس نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ محرم منایا اور وہ اسلام قبول کرنے اور بادشاہ کے دستر خوان پر گرے ہوئے ٹکڑے کھانے کے لیے بے چین ہے۔ مجھے ایک نہایت خفیہ طریقے سے اطلاع ملی ہے کہ گوالیار کے راجہ نے انفنٹری کی تین بیڑیاں اور کیولری کی ایک رجمنٹ باغیوں کی مدد کے لیے روانہ کی ہیں۔ یہ فوج

دریائے چمبل کے کنارے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ بارش کی وجہ سے دریا میں طغیانی آگئی ہے اس لیے وہاں پر پل بنانے سے قاصر ہے۔''

- ۴، ستمبر: محاصرہ شکن توپوں اور اسلحہ بارود سے لدا قافلہ انگریزی کیمپ پہنچا۔
- ۶، ستمبر: میرٹھ سے مزید توپیں اور کرنال سے پنجاب انفنٹری کا دستہ انگریزی کیمپ پہنچا۔
- ۷، ستمبر: راجہ جیند کی فوجیں انگریزوں کی مدد کو پہنچیں۔ انگریزی فوج کا قدسیہ باغ کے مورچے پر حملہ اور قبضہ۔
- ۸، ستمبر: دن بھر توپوں کی گولہ باری۔ شام کو باغی فوج کا انگریزی فوج پر فیصلہ کن حملہ۔ قدسیہ باغ پر انگریزوں کو شکست اور باغی فوجوں کا دوبارہ قبضہ۔ راجہ کشمیر کی مزید تین ہزار فوج انگریزوں کی مدد کو پہنچی۔ انگریزوں نے محاصرہ شکن توپیں محاذ پر نصب کرلیں۔
- ۹، ستمبر: باغی فوج کے جاسوسوں نے انگریزی کیمپ میں بارود سے لدا چھکڑا اُڑا دیا۔
- ۱۰، ستمبر: انگریزی فوج کا حملہ ایک مورچے پر بارود تباہ ہونے کے سبب ملتوی۔ کشمیری دروازے کے برج کو انگریزوں کی گولہ باری سے نقصان۔ باغی فوج کی کیولری کا انگریزی فوج کے مورچوں کے عقب میں پہنچ کر شدید حملہ۔ بیشتر سوار ہلاک یا زخمی۔
- ۱۲، ستمبر: انگریزی توپوں کی قلعے پر گولہ باری۔
- ۱۳، ستمبر: انگریزی مورچوں سے ساٹھ بڑی اور محاصرہ شکن توپوں سے قلعہ اور شہر کی فصیلوں پر لگاتار گولہ باری۔ ہندوستانی فوج کی توپیں خاموش۔ باغی فوج کی تعداد چالیس ہزار سے گھٹ کر دس ہزار رہ گئی۔
- ۱۴، ستمبر: صبح سات بجے انگریزی فوج کی دہلی پر یلغار۔ ہندوستانی فوج نے جم کر مقابلہ کیا۔ انگریزی فوج کے پانچ سو سے زیادہ سپاہی اور کرنل نکلسن سمیت تمیں افسر ہلاک۔ کشمیری، کابلی اور موری دروازوں، سکنر (Skinner) کی حویلی، دہلی کالج اور چرچ کی عمارتوں پر انگریزی فوج کا قبضہ۔ کشن گنج کے محاذ پر میجر ریڈ (Reed) کو شکست۔ مہاراجہ کشمیر کی فوج شکست کھا کر بھاگنے پر مجبور۔
سلیم گڑھ شاہی قلعہ میگزین پر باغی فوج نے اپنے مورچوں پر ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

- ۱۶، ستمبر: انگریزی فوج کا علی الصبح حملہ۔ کشتیوں کے پل اور میگزین پر انگریزوں کا قبضہ۔ اسلحہ خانے میں صرف ۱۷ ہتھیار اور گولوں کے کچھ خالی خول باقی تھے۔ بارود بالکل ختم ہو چکا تھا۔ ہندوستانی فوج نے تیلی واڑہ اور کشن گنج کے علاقے خالی کر دیئے۔ سلیم گڑھ اور قلعہ پر محاصرہ شکن توپوں کی مسلسل گولہ باری۔
- ۱۷، ستمبر: شاہی محل اور قلعہ پر گولہ باری ہوتی رہی۔ شہر میں ہندوستانی فوجیں چپہ چپہ پر زبردست مقابلہ کرتی رہیں۔ انگریزی فوج کے بارہ سو سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے۔ اس کے باوجود ہندوستانی اس لیے ناکام ہوئے کہ ان کی صفوں میں غدار گھسے ہوئے تھے اور جنگی حکمت عملی ناکام کرنے کے علاوہ ان کی پل پل کی سرگرمیوں کی خبر انگریزوں کو دے رہے تھے۔ ۲۰ ستمبر کو انگریزوں نے دہلی کو دوبارہ فتح کرلیا۔ مجاہدین بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے۔ آخری وقت تک انگریزوں کا نقصان ہو رہا تھا مگر غداروں نے ان کی فتح کے لیے آخری دم تک کوشش جاری رکھی۔ مولوی رجب علی کا یہ خط ۱۵، ستمبر کا ہے:

> ''میں آپ کے حکم کی تعمیل میں خبریں حاصل کرنے کے لیے شہر کی فصیل کے قریب گیا تھا یہاں پر زخمی سپاہیوں سے لدی ہوئی بے شمار ڈولیاں موجود تھیں۔ جنرل نکلسن کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی ہے وہ جنرل چمبرلین، مسٹر گریٹ ہیڈ، سر مٹکاف اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گرجا گھر میں جمع تھے کہ باغیوں نے بندوق کے ساتھ اچانک ایک زبردست حملہ کر دیا۔
>
> انگریزی جھنڈا کشمیری دروازے کے اوپر لہرا کر انگریزی فوج کی فتح کا اعلان کر رہا ہے۔ سنا ہے کہ باقی فوج کے سب دستے قطب جانے والی سڑک اور دوسرے راستوں سے ریواڑی کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ لیکن اجمیری دروازے کے قریب ابھی بھی ان کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ سوار بھاگنے والے سپاہیوں کو واپس لا کر لڑنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن کوئی واپس نہیں آتا۔ شہر میں دہلی دروازے تک باغیوں کی کوئی زیادہ تعداد موجود نہیں۔
>
> انگریزی فوج اپنی توپیں کنٹونمنٹ سے شہر میں لے آئی ہے

اور توپ کے گولے شاہی محل پر گر رہے ہیں۔ جنرل ولسن اور کرنل نیچر، دونوں شہر میں ہیں۔ انگریزی فوج نے شہر پر دو طرف سے حملہ کیا تھا۔ ایک تیلی واڑہ (موری دروازہ) کی طرف سے اور دوسرا کشمیری دروازہ کی طرف سے۔ کشمیری دروازہ پر حملہ کرنے کے دوران ہمارے تقریباً ایک سو پچاس سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے جنید کی فوج کے پانچ یا چھ سوار بھی اس حملے میں مارے گئے۔ شہر کے جس جس حصہ میں ہمارا قبضہ ہوا ہے وہاں کی تمام دکانیں لوٹ لی گئی تھیں۔ انگریزی حکام نے شہر کے دروازوں پر پہرہ لگا دیا ہے اور لوٹا ہوا سامان سپاہیوں سے لے کر ایک محافظ کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ اس حملے کے دوران تقریباً دو ہزار باغی ہلاک اور تقریباً ایک ہزار زخمی ہوئے تھے۔ آج کے حالات کی تفصیلات ابھی نہیں ملیں۔ اس حملے کے دوران کشمیر کی فوج تیلی واڑہ کے قرب و جوار میں تھی۔ جب باغی فوج نے ان پر گولہ باری شروع کی تو یہ فوج اپنی تمام توپیں چھوڑ کر بھاگ نکلی جو دشمن کے قبضے میں آگئیں۔ انگریزی فوج نے بڑی مشکل سے یہ توپیں واپس لیں۔ اس حملے میں انگریزوں کا کافی نقصان ہوا۔ سینکڑوں باغی بھی اس حملے میں مارے گئے۔ اگر انگریزی فوج مداخلت نہ کرتی تو یہ توپیں اب بھی دشمن کے ہاتھ میں ہوتیں۔

نجف گڑھ سے ایک ہرکارے نے آکر اطلاع دی ہے کہ اس نے باغی فوج کے سواروں کو پچاس پچاس کے گروہوں میں نجف گڑھ کے قریب بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔"

- ۱۸، ستمبر: شاہی محل اور قلعہ پر گولہ باری جاری۔ لاہوری دروازے پر انگریزی فوجوں کو شکست۔ دوسرے ہی دن یہ فتح شکست میں کیوں بدل گئی اس کا جواب جان ولیم کی کتاب Sepoy War in India کے اس اقتباس میں موجود ہے:

"..... ہندوستان میں ہماری بحالی کا سہرا ہمارے ہندوستانی پیرو کاروں کے سر ہے جن کی ہمت اور جسارت نے ہندوستان کو اپنے ہم وطنوں سے لے کر ہمارے حوالے کر دیا۔"

- ۱۹، ستمبر: جامع مسجد، شاہی قلعہ اور سلیم گڑھ پر گولہ باری ہوتی رہی۔ بریلی بریگیڈ کی متھرا کی طرف روانگی کی خبر۔ لاہوری دروازے پر انگریزی فوج کا قبضہ۔ شہر و قلعہ پر بھی انگریزی فوج کا قبضہ۔ شہر اور قلعے میں موجود زخمی سپاہیوں کا ہوڈسن کے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل عام۔ بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی۔ بہادر شاہ ظفر کو ہمایوں کے مقبرہ تک لانے اور پھر انھیں خود سپردگی پر مجبور کرنے میں مرزا الٰہی بخش اور مولوی رجب علی نے بہت گھناؤنا کردار ادا کیا تھا۔ جنرل بخت خاں نے بادشاہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ ابھی صرف دلّی ہاتھ سے گئی ہے پورا ملک پڑا ہے۔ بادشاہ راضی ہورہا تھا کہ الٰہی بخش نے بادشاہ میں عصبیت پیدا کرنے کے لیے کہا کہ چونکہ ہمایوں (مغل) نے شیر شاہ سوری (پٹھان) کو شکست دی تھی اس لیے جنرل بخت خاں بدلہ لینے کے لیے بادشاہ کو غلط مشورے دے رہا ہے۔ بادشاہ الٰہی بخش کے بہکاوے میں آگیا لیکن جلد ہی اس کو احساس ہوا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے مگر اس وقت تک جنرل بخت خاں رخصت ہوچکا تھا۔
- ۲۱، ستمبر: ہوڈسن، مولوی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش کی بادشاہ سے مذاکرات۔ بادشاہ نے جاں بخشی کے وعدے پر خود کو ہوڈسن کے حوالے کردیا۔
- ۲۲، ستمبر: میجر ہوڈسن نے تین شہزادوں کو ہمایوں کے مقبرے سے شاہی محل لاتے ہوئے راستے میں قتل کردیا اور ان کی لاشیں کوتوالی کے سامنے پھینک دیں یا لٹکانے کا حکم دیا۔

بہادر شاہ ظفر نے جن لوگوں پر اعتماد کرکے جنرل بخت خاں کے مشورے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا وہ یہی چاہتے بھی تھے۔ بہادر شاہ کی گرفتاری کے بعد مرزا الٰہی بخش اور مولوی سید رجب علی اور دوسروں کو جو اعزازات ملے یا پنشن عطا ہوئی اس سے ان کے اصل چہروں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ غالب، بہادر شاہ ظفر سے زیادہ ان لوگوں کے مداح تھے جنھوں نے بہادر شاہ ظفر کو بالآخر گرفتار اور ان کے شہزادوں کو قتل کروایا تھا۔ زیادہ سے زیادہ آسائش حاصل کرنے کی خواہش نے غالب کو یہ باور کرادیا تھا کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد انگریز برسر اقتدار آئیں گے اور ان کے مخبروں اور ایجنٹوں سے تعلقات استوار کرکے ہی انعام و اعزاز حاصل کیا جاسکتا ہے مگر وہ اس حقیقت کو سمجھنے میں ناکام رہے کہ انگریز بھی ہمیشہ اس ملک پر قابض یا حکمراں نہیں رہیں گے۔ اور یہی ہوا بھی۔ ۱۸۵۷ء کے صرف ۹۰

برس اور غالب کے انتقال کے صرف ۷۸ برس بعد انگریزوں کو آزادی کے لیے متعین تاریخ سے پہلے ہی ہندوستان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ غالب یقیناً اردو ہی کے نہیں ہر عہد کے بڑے شاعروں کی فہرست میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں مگر بہتر سے بہتر زندگی اور زیادہ سے زیادہ آسائش حاصل کرنے کی کوشش میں جو انھیں حاصل بھی نہیں ہوئی، ۱۸۵۷ء کے دوران ہی نہیں، اس کے بعد کے ۱۲ برسوں میں بھی انھوں نے جو کیا اور لکھا وہ ان کے چاہنے والوں کو گراں گزرتا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کو تو سمجھا کہ ۱۸۵۷ء ایک عہد اور ایک نظامِ حکومت کا خاتمہ ہے لیکن یہ حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے کہ ۱۸۵۷ء ایک عہد کا آغاز بھی ہے کیونکہ ملک و قوم کا ضمیر زیادہ دنوں غلامی پر آمادہ نہیں رہتا اور ہندوستان بھی جبر وظلم کی ان راتوں کو آزادی کی صبح سے بدلنے میں کامیاب ہوگا۔ بہادر شاہ ظفر نے ۱۸۵۷ء میں چاہے بہت بڑا کارنامہ نہ انجام دیا ہو مگر مجبوراً یا خوشی سے انھوں نے جو بھی کیا وہ انھیں ہندوستان کی متحدہ قومیت کی علامت کی حیثیت سے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد متحدہ قومیت کا یہ تصور مضبوط تر ہوتا رہا۔ ایک اور اہم کام یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء کی مزاحمت نے عام ہندوستانیوں کو ان کے معاشی اور سماجی حقوق کا احساس دلایا۔ شہزادہ فیروز کا ۲۵ اگست ۱۸۵۷ء کو جاری کیا ہوا اعلانیہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جو ہوا اس کی تنہا وجہ مذہبی جذبات کا مجروح ہونا نہیں تھا۔ بہت سی معاشی وجوہ بھی تھیں جن سے بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ شہزادہ فیروز کے اعلانیہ میں کئی ایسی باتیں ہیں جن کی روشنی میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کے معاشی محرکات سامنے آتے ہیں۔

> ''یہ سب لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کے لوگ، ہندو اور مسلمان دونوں کافر اور دھوکہ باز انگریزوں کے ظلم اور زیادتیوں سے تباہ ہورہے ہیں، اس لیے ہندوستان کے تمام امیر لوگوں کا یہ لازمی فرض ہے خاص طور پر ان کا جن کا کسی بھی طرح مسلمان شاہی خاندانوں سے کوئی تعلق ہے اور جن کو لوگوں کا مرشد اور مالک سمجھا جاتا ہے کہ وہ عام لوگوں کی بھلائی کے لیے اپنی جان اور مال کی بازی لگائیں۔ اس عام مقصد کو پورا کرنے کے لیے دہلی کے شاہی خاندان کے کئی شاہزادوں نے خود ہندوستان، ایران، توران اور افغانستان کے مختلف حصوں کا دورہ کیا ہے اور بہت دنوں سے اقدام اُٹھاتے رہے ہیں کہ اب اپنے

محبوب مقصد کو حاصل کریں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے مذکورہ بالا شہزادوں میں سے ایک نے افغانستان کی فوج کی سربراہی کرتے ہوئے ہندوستان میں قدم رکھا ہے اور میں جو ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ غازی، ہندوستان کا پوتا ہوں، دورہ پورا کرکے یہاں کافروں کے خاتمے کے لیے آیا ہوں جو ملک کے مشرقی حصہ میں رہ رہے ہیں تاکہ لوگوں کو آزاد کرکے بے چارے غریب لوگوں کی حفاظت کرسکوں جو اس وقت ان کی آہنی حکومت میں کراہ رہے ہیں اور مجاہدین کی مدد سے یا ان جنگ آزماؤں کی مدد سے جو مذہب کے لیے علم محمدی بلند کرکے اور راسخ العقیدہ ہندوؤں کو راضی کرکے جو ہمارے بزرگوں کی رعایا تھے اور پہلے بھی اور آج بھی انگریزوں کے تباہ کرنے میں مہاویری جھنڈا بلند کرکے ہمارے ساتھ ہیں ......

کسی شخص کو بھی انگریزی حکومت کے بہی خواہوں کے غلط بیان سے، موجودہ تکلیف کے پیش نظر جو انقلابات کے ساتھ لازمی ہیں یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ اسی طرح کی تکالیف اور مصیبت بادشاہی حکومت کے محکم قیام کے بعد بھی جاری رہیں گی، اور وہ لوگ جن کے ساتھ کسی فوجی یا لٹیرے نے بدسلوکی کی ہو، آکر اپنی شکایت میرے سامنے پیش کرے، میرے ذریعہ داد رسی ہوگی۔ موجودہ حالات میں ان کی جو بھی جائداد ضائع ہوگی، جب بادشاہی حکومت اچھی طرح قائم ہوجائے گی اس کو عوام کے خزانے سے پورا کیا جائے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ انگریزی حکومت نے زمینداری بندوبست کے ذریعہ حد سے زیادہ جمع لگا دی ہے اور بہت سے زمینداروں کو رسوا اور برباد کردیا ہے اور ان کی زمینداریاں مال گذاری کے بقایا کی علت میں نیلام کرادی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک معمولی رعیت، ملازمہ یا ملازم کے مقدمہ دائر کردینے پر، عزت دار زمینداروں کو عدالت طلب کیا جاتا ہے، گرفتار کرکے جیل میں ڈال کر انھیں بے عزت کیا جاتا ہے۔ زمینداروں کے مقدمات کے سلسلہ میں بہت زیادہ

قیمت کے اسٹیمپ اور دیوانی عدالت کے دوسرے غیر ضروری اخراجات، جو ہر طرح کی چالبازانہ داؤں پیچ پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہر ایک مقدمہ کو برسوں تک لٹکائے رکھنے کا عمل ہے تاکہ مدعیان اور غریب ہوجائیں۔ علاوہ اس کے زمینداروں کی جیب پر اسکولوں، اسپتالوں اور سڑکوں وغیرہ کے لیے چندہ کے نام پر سالانہ بوجھ ڈالا جاتا ہے۔ اس طرح کی چھین جھپٹ کے لیے بادشاہی حکومت میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ برخلاف اس کے جمع ہلکی ہوگی، زمینداروں کی عزت اور وقار محفوظ ہوگا اور ہر ہر زمیندار کو اپنی زمینداری کے اندر حکومت کا مکمل اختیار ہوگا۔ زمینداری کے قبضے شرع اور شاستروں کے مطابق بغیر خرچ کے جلد طے کیے جائیں گے۔ وہ زمینداران جو موجودہ جنگ میں اپنے آدمیوں اور مال سے مدد کریں گے ہمیشہ کے لیے نصف مال گذاری کی ادائیگی سے معاف کردیے جائیں گے۔ وہ زمینداران جو صرف روپیوں سے مدد کریں گے ان کی مال گذاری ہمیشہ کے لیے معاف ہوگی اور وہ زمیندار جن کو انگریزی حکومت نے ناحق طور پر ان کی زمین سے محروم کردیا ہے اور وہ ذاتی طور پر اس جنگ میں شرکت کرتے ہیں تو ان کی زمینداری کو بحال کردیا جائے گا اور 1/4 حصہ مال گذاری کی ادائیگی سے مستثنیٰ کردیا جائے گا۔

تاجروں کے بارے میں یہ صاف ہے کہ کافر اور دھوکہ باز برٹش حکومت نے تمام قیمتی سامان تجارت پر اجارہ داری قائم کر رکھی ہے جیسے نیل، کپڑے اور دوسرے برآمدی مصنوعات، صرف معمولی سامان تجارت کو لوگوں کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور اس میں بھی ان کے اپنے منافع کا حصہ برقرار ہے جو وہ کسٹم اور اسٹیمپ فیس مقدمات مال وغیرہ کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں اس طرح عام لوگوں کے پاس صرف نام کی ہی تجارت ہے۔ اس کے علاوہ تاجروں کے منافع پر ڈاک محصول، چنگی محصول، اسکولوں کے لیے چندہ وغیرہ کے نام پر عائد کیا جاتا ہے۔ باوجود ان تمام مراعات

کے تاجر، ایک معمولی فرد یا ایک نکمے آدمی کی شکایت پر سزا اور بے عزتی کا شکار ہوتے ہیں۔ جب بادشاہی حکومت قائم ہوجائے گی یہ تمام دھوکہ دھڑی کی کاروائی ختم کردی جائے گی اور ہر قسم کی تجارت بغیر استثنٰی کے زمین اور سمندر کے راستوں ہندوستانی تاجروں کے لیے کھلی ہوگی جن کو سرکاری دُخانی جہاز (بھاپ کے جہاز) اور بھاپ سے چلنے والی گاڑیوں کی سہولت اپنے سامان لے جانے کے لیے حاصل ہوگی۔ وہ تاجرین جن کے پاس سرمایہ نہیں ہوگا ان کو سرکاری خزانہ سے مدد دی جائے گی۔ اس لیے ہر ایک تاجر کا یہ فرض ہے کہ اس جنگ میں حصہ لے اور بادشاہی سرکار کی جان و مال سے خفیہ یا اعلانیہ طور پر مدد کرے، جیسا کہ ان کے حال کے مطابق ہو یا دلچسپی ہو اور برٹش حکومت سے اپنی وفاداری ترک کردے۔

سرکاری ملازمین کے متعلق یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ انگریزی حکومت کے تحت فوج اور شہری ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی کوئی عزت نہیں، تنخواہیں کم ہیں اور رسوخ کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تمام اعلٰی منصوبوں اور بڑی تنخواہوں کی جگہیں ان دونوں محکموں میں انگریزوں کو دی جاتی ہیں۔ مقامی باشندے جو اپنی زندگی کا بڑا حصہ نذر کردیتے ہیں صوبہ داری کے عہدے تک پہنچ پاتے ہیں (جو ان کی تمناؤں کی معراج ہے) جہاں ساٹھ یا ستر روپے ماہوار تنخواہ ہے اور وہ لوگ جو شہری ملازمتوں میں ہیں صدر اعلٰی کے عہدے پر جس کی تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہانہ حاصل کرتے ہیں۔ جس پر نہ کوئی رسوخ ہے نہ جاگیر اور نہ ہی تحفہ لیکن بادشاہی حکومت کے تحت کرنل، جنرل اور کمانڈر انچیف کے عہدے، جو فی الوقت انگریزوں کے پاس ہیں، اس کے متوازی مناصب جیسے پانصدی، پنج ہزاری، ہفت ہزاری اور سپہ سالاری وغیرہ دیسی افراد کو جو فوجی ملازمت میں ہیں دی جائیں گی۔ کلکٹر، مجسٹریٹ، جج، صدر جج، سیکریٹری اور گورنر کے عہدے، جو اس وقت یوروپین شہری ملازمین کے پاس ہیں، متوازی عہدے جیسے

وزیر، قاضی نیز صوبہ ناظم اور دیوان وغیرہ لاکھ روپے تنخواہ کی عہدوں پر دیسی شہری ملازمین کو مع جاگیر، خلعت اور انعامات اور رسوخ سے نوازا جائے گا۔ دیسی ہندو یا مسلمان جو انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوں گے یقیناً جنت میں جائیں گے اور وہ لوگ جو انگریزوں کے لیے جنگ کریں گے بلاشبہ دوزخ میں جائیں گے۔ اس لیے تمام دیسی افراد کو جو انگریزوں کی ملازمت میں ہیں، اپنے مذہب اور مفاد سے باخبر ہونا چاہیے اور انگریزوں کی وفاداری ترک کر کے بادشاہی حکومت کا ساتھ دینا چاہیے اور فی الوقت دو سو یا تین سو روپے ماہانہ حاصل کریں اور مستقبل میں اعلیٰ عہدوں کے مستحق ہوں۔ اگر وہ کسی وجہ سے، فی الوقت انگریزوں کے خلاف کھل کر اعلان نہیں کر سکتے تو دل میں ان کا برا چاہیں اور موجودہ حالات میں بغیر کوئی حصہ لیے، خاموش تماشائی رہیں۔ لیکن اس وقت ان کو بلاواسطہ بادشاہی حکومت کی مدد کرنی چاہیے اور اپنی بہترین کوشش انگریزوں کو ملک سے باہر نکال دینے کی کرنی چاہیے۔

وہ تمام فوجی اور سوار جنھوں نے اپنے مذہب کی خاطر اور انگریزوں کی تباہی کے لیے ساتھ دیا اور ہر وقت کسی وجہ سے خواہ وہ اپنے وطن میں وطن سے باہر پوشیدہ ہیں، ان کو میرے پاس بغیر کسی تاخیر اور ہچکچاہٹ کے حاضر ہونا چاہیے ......

اہل حرفہ کے متعلق یہ واضح ہے کہ فرنگیوں نے انگریزی مصنوعات کو ہندوستان میں رائج کر کے، جولاہوں، ندافوں، بڑھیوں، لوہاروں اور جوتا بنانے والوں کو بے روزگار بنا دیا ہے اور ان کے پیشہ پر قبضہ جمالیا ہے یہاں تک کہ ہر قسم کے دیسی اہل حرفہ کو بھکاری بنا دیا ہے۔ لیکن بادشاہی حکومت کے تحت دیسی اہل حرفہ خصوصی طور پر بادشاہوں، راجاؤں اور امیر لوگوں کی خدمت میں ملازم ہوں گے اور بلاشبہ یہ ان کی خوش حالی کی ضمانت ہوگی۔ اس طرح ان کاریگروں کو انگریزی ملازمت کو چھوڑ دینا چاہیے اور مجاہدین کے ساتھ مل کر مذہب کی خاطر جنگ کرنی چاہیے اور اس طرح سیکولر اور دوامی خوشی

کا حقدار بننا چاہیے ......

آخر میں یہ سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ مذکورہ بالا طریقوں میں جو بھی اس اشتہار کے مشتہر ہونے کے بعد انگریزی حکومت کا وفادار رہے گا اس کا تمام علاقہ ضبط کرلیا جائے گا اور جائیداد لوٹ لی جائے گی، اسے اور اس کے پورے خاندان کو قید کرلیا جائے گا اور بالآخر ہلاک کردیا جائے گا۔"

وہ معاشی محرکات آج بھی موجود ہیں اور پھر پہلے تو ایک ہی ایسٹ انڈیا کمپنی آئی تھی مگر اب ملٹی نیشنلز کی شکل میں بہت سی ایسٹ انڈیا کمپنیاں سرگرم عمل ہیں۔ اس لیے سیاسی آزادی حاصل ہونے کے باوجود معاشی آزادی کی جدوجہد جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔